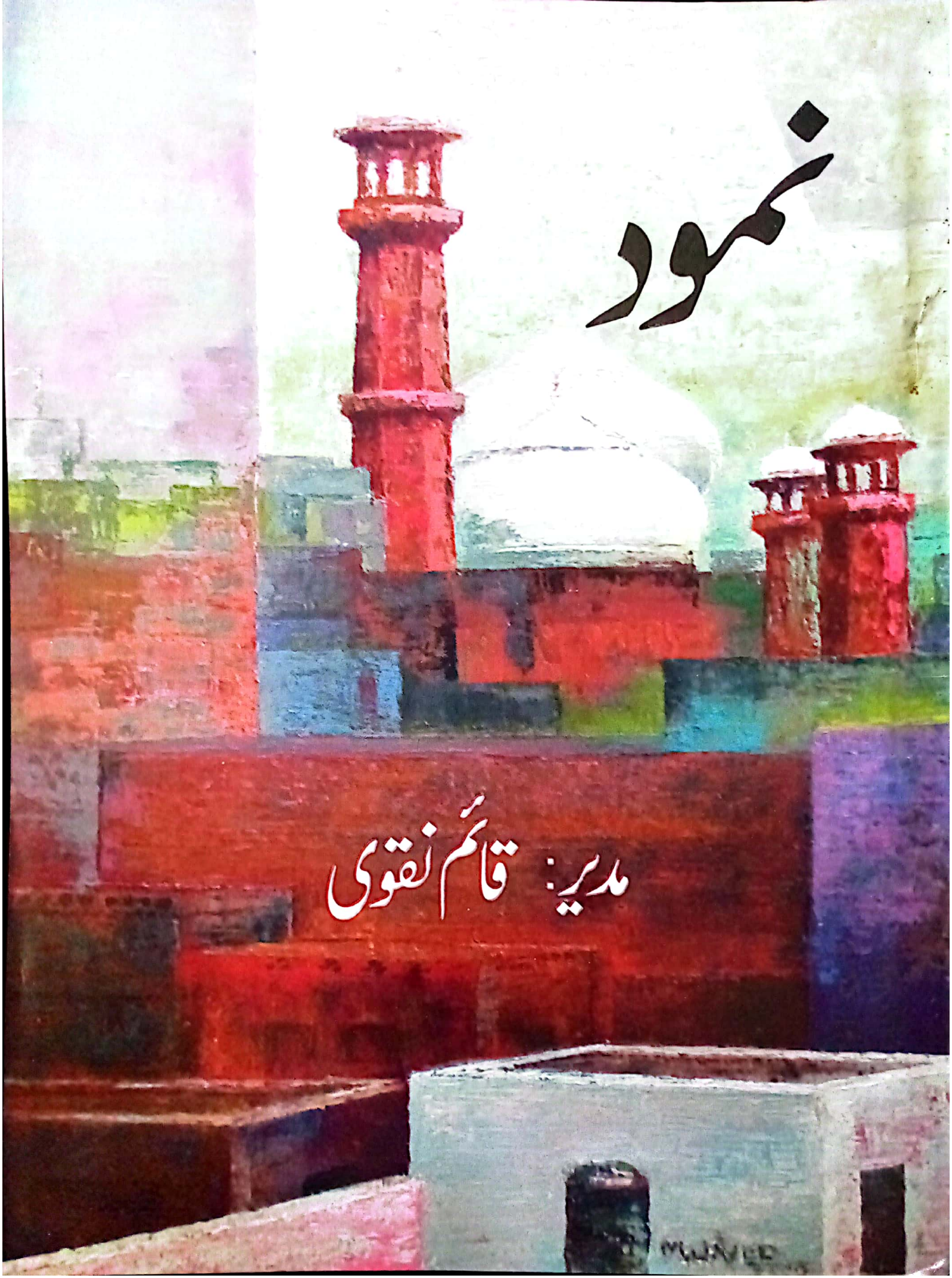
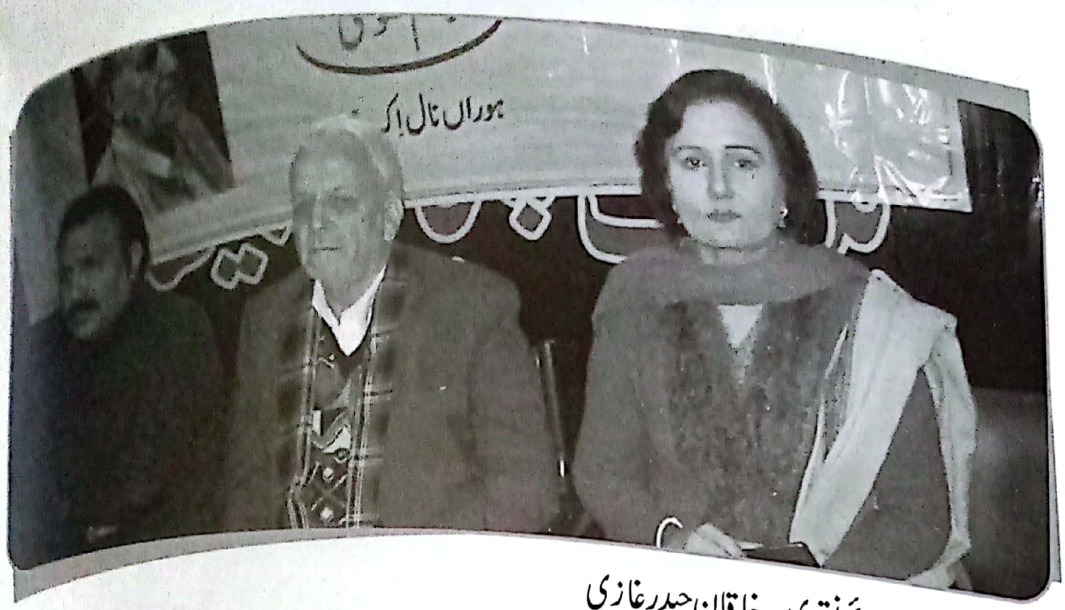
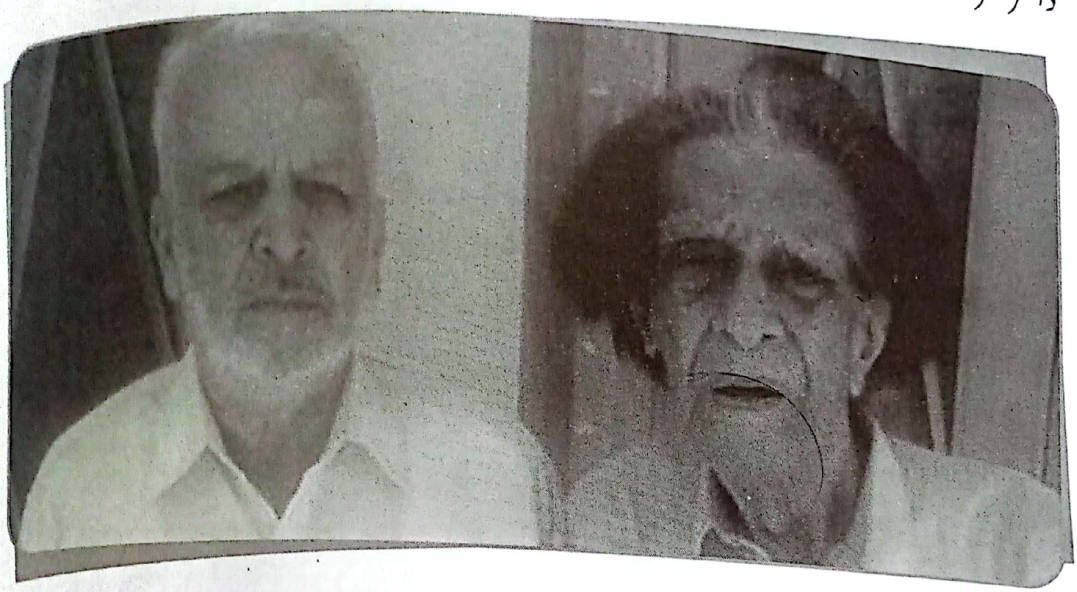


Scanned with CamScanner



ڈاکٹر صغرا صدف، قائم نقوی، خاقان حیدر غازی



مشکور حسین یاد، قائم نقوی



فاطمہ حسن، منیر نیازی، عمران شناور

Scanned with CamScanner

ماہنامہ نمود لاہور

مدیر
قائم نقوی

☆☆☆☆

جلد نمبر 7 شمارہ نمبر 4,5,6

☆☆☆☆

اپریل، مئی، جون 2019ء

☆☆☆☆

فی شمارہ -/120 روپے
بمعہ ڈاک خرچ -/100 روپے
بیرون ممالک -/10 ڈالر

☆☆☆☆

زرسالانہ بمعہ ڈاک خرچ -/800 روپے
بیرون ممالک -/60 ڈالر

☆☆☆☆

ٹیلی فون: 042-35974195
03015253177:
03314822964:

☆☆☆☆

ای میل
namood.qaimnaqvi@gmail.com

ادارے کا مضمون نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے

پتہ: 56۔ کوچہ سیف الملوک، سلیم سٹریٹ، چھپڑ سٹاپ، ملتان روڈ، لاہور

قائم نقوی نے نقوی برادرز دربار مارکیٹ لاہور سے چھپوا کر چھپڑ سٹاپ ملتان روڈ سے شائع کیا۔

Scanned with CamScanner

فہرست

نعت — ۳
احمد فراز

مضامین
مجید امجد کی تمثال آفرینی — ڈاکٹر محمد امین — ۴
آبی رنگ (واٹر کلر) پینٹنگز کی کہانی — محمد جاوید — ۷
نسیما! جانبِ بطحا گزر کُن — محمد ظفر الحق چشتی — ۱۶
اُردو کی ایک اہم غیر مطبوعہ خودنوشت — پروفیسر ڈاکٹر مزمل حسین — ۲۵
جیسے کلیاں اچھال دے کوئی — خورشید بیگ میلسوی — ۴۱
علامہ اقبال کی شاعری اور اساطیر — ڈاکٹر تقدیس زہرا — ۴۴
خدیجہ مستور کے دو ناول — غلام دستگیر ربانی — ۴۸

فن اور فنکار — پروفیسر سلیم الرحمٰن — ۵۲
حامد علی بیلا — ۵۹

غزلیں
مشکور حسین یاد، مرتضیٰ برلاس، ناصر زیدی، شفیق سلیمی، نسیم سحر، اختر کاظمی، اکرم ناصر، شہناز پروین سحر، عارف ضیاء، ظہور احمد، سید اظہر فرید، ارشد چہال، رفعت زہرا زیدی، حریم حیدر، قائم نقوی

افسانے
کبوتر — محمود احمد قاضی — ۷۳
انا کی جنگ — شمع خالد — ۷۷
آدھی آدھا — ساجد عمر گل — ۸۲
۳ اور ۴ اپریل کی شب جاگتے رہنا — حشمت لودھی — ۸۷

نظمیں — ۹۰
شاہین مفتی، شہناز پروین سحر، اختر کاظمی، تنویر قاضی، ندیم عزیز، سہیل ممتاز خاں، حریم حیدر، ڈاکٹر منیر رئیسانی، احمد طلال، قائم نقوی

بزمِ نمود — ۹۹
رفعت زہرا زیدی، ہری پور

سرورق: محمد جاوید

Scanned with CamScanner

احمد فراز

ابیات

بحضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم

مرے رسولؐ کہ نسبت تجھے اجالوں سے
میں تیرا ذکر کروں صُبح کے حوالوں سے

نہ میری نعت کی محتاج ذات ہے تیری
نہ تیری مَدح ہے ممکن مرے خیالوں سے

تو روشنی کا پیمبر ہے اور مری تاریخ
بھری پڑی ہے شبِ ظُلم کی مثالوں سے

ترا پیام محبت تھا اور میرے یہاں
دِل و دماغ ہیں پُر نفرتوں کے جالوں سے

یہ افتخار ہے تیرا کہ میرے عرش مقام
تُو ہمکلام رہا ہے زمین والوں سے

مگر یہ مُفتی و واعظ یہ محتسب یہ فقیہہ
جو مُعتبر ہیں فقط مصلحت کی چالوں سے

خُدا کے نام کو بیچیں مگر خُدا نہ کرے
اثر پذیر ہوں خلقِ خُدا کے نالوں سے

نہ میری آنکھ میں کاجل نہ مشکبُو ہے لباس
کہ میرے دِل کا ہے رشتہ خراب حالوں سے

ہے تُرش رو مری باتوں سے صاحبِ منبر
خطیبِ شہر ہے برہم مرے سوالوں سے

مرے ضمیر نے قابیل کو نہیں بخشا
میں کیسے صُلح کروں قتل کرنے والوں سے

میں بے بساط سا شاعر ہُوں پر کرم تیرا
کہ باشرف ہُوں قباو کلاہ والوں سے

Scanned with CamScanner

مجید امجد کی تمثال آفرینی

ڈاکٹر محمد امین

مجید امجد کا ذہنی افق بہت وسیع تھا اور مجید امجد کے تصورات اور خیالات کا سرمایہ بھی بہت وسیع تھا۔ وہ فعال تخلیقی قوت کے مالک تھے اور ان کا ذہن تخلیقی صلاحیتوں سے معمور تھا۔ شاعر فطرت سے حسن مستعار لے کر اپنے لفظوں کے ذریعے سے حسنِ فطرت میں اضافہ کرتا ہے۔ اس کے تخلیقی حسن کے کئی زاویے ہیں۔ خوبصورت تشبیہوں اور استعاروں سے مسجع تصویر کشی اور نظر کشی بھی اک پہلو ہے۔ مجید امجد کی شاعری میں تصویر کشی اور منظر نگاری کی خوبصورت مثالیں ہیں۔ تمثال آفرینی بھی ایک اہم پہلو ہے۔ تمثال پسندی کی تحریک نے بھی اردو کے بہت سے شاعروں کو متاثر کیا۔ تمثال شاعری کے حسن کو دوبالا کرتی ہے۔ مجید امجد نے تمثال آفرینی میں بڑا زرخیز ذہن پایا ہے۔ مجید امجد کی کئی نظمیں اور کئی نظموں کے کچھ حصے تمثال بن گئے ہیں مثلاً کنواں کی مکمل نظم تمثال کا تاثر دیتی ہے، نہ کوئی سلطنت غم ہے نہ تعلیم طرب میں نغمہ کواکب کا حصہ صوتی تمثال آفرینی کی قابلِ ذکر مثال ہے۔ تمثال کا زیادہ تر تعلق بھارت سے ہے لیکن مجید امجد کے یہاں سمعی تمثالیں بھی ملتی ہیں۔ یہ صورتی تمثال آفرینی ہے، دیکھئے:

والمؤس

ناچ ناچ جھوم جھوم

گھوم گھوم گھوم گھوم

دیکھنا ادھر ضرور　　اک نظر

ناچتا ہے نزدودور　　بے خبر

دامن نگار نور　　تھام کر

کہکشاں کے موڑ پر　　فاصلوں کا اک ہجوم

ناچ ناچ　　گھوم گھوم

Scanned with CamScanner

وسعتِ ابد پناہ　　اک ترنگ
عالم شب سیاہ　　اک اور نگ
منزلیں نشان راہ　　سو رنگ
شعلہ شعلہ انگ انگ　　آگ آگ روم روم
گھوم گھوم　　گھوم گھوم　　(نغمۂ کواکب)

الفاظ کی صوت سے تمثال آفرینی کی گئی ہے۔ جو سیاروں کے مسلسل پیہم گھومنے کا تاثر دیتی ہے اور یہ تاثر اتنا بھرپور ہے کہ یہ سیارے گھومتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

مجید امجد کے یہاں ایسی کئی مثالیں ہیں جہاں صوتیات بھی تمثال کا حصہ بن جاتی ہیں اور ان کا پیدا کردہ تاثر تمثال کو سحر آفرین بنا دیتا ہے۔ یہ شعر بھی دیکھئے:

گرمی دھڑام سے گھائل پیڑوں کی نیلی دیوار
کٹتے ہیکل، جھڑتے پنجر، چھٹتے برگ و بار　　(توسیع شہر)

تمثال آفرینی میں لفظوں کا چناؤ اور ان کا آہنگ بھی شامل ہوتا ہے۔ لفظوں کی صوتیات بھی تمثال کو اور بھی پُرکشش بنا دیتی ہے۔ تمثال آفرینی کو خواب دیکھنے سے تشبیہ دی جاتی ہے اور اس کا منبع لاشعور میں تلاش کیا جاتا ہے۔ لیکن مجید امجد کی تمثال آفرینی میں تفکر کر عنصر غالب ہے۔ ان کی تمثیلوں کے پیچھے ان کا وسیع مطالعہ اور ان کی فکر شامل ہے۔

ترکیب سازی بھی تمثال آفرینی کا حصہ ہے۔ غالب نے اردو شاعری کو نادر اور جدید تراکیب دیں۔ مجید امجد کی تراکیب بھی اردو شاعری کا گراں قدر سرمایہ ہیں۔ یہ شعر دیکھئے:

قرنوں کے بجتے انگار، اک موج ہوا کا مرہم
صدیوں کے ماتھے کا پسینہ پشتوں پر شبنم
(سمجھی ہوئی نسلو)

اس شعر میں الفاظ جو تمثال بناتے ہیں وہ کتنی فکر انگیز ہے اس کے پیچھے ایک فلسفۂ سائنس ہے

بجتی ڈھولک، گاتی سیاں، نیر بہاتی خوشیاں
جاگتے ماتھے، سوچتے نیناں..... آنے والے زمانے
(جیون دیس)

Scanned with CamScanner

ان دو مصرعوں میں جہانِ معانی آباد ہے۔ مجید امجد نے چند لفظوں میں کئی مفاہیم شامل کر دیئے ہیں نیر بہاتی خوشیاں، خوشی کے آنسو بھی ہوتے ہیں خوشی کے ساتھ اندیشے اور حسرتیں بھی ہوتی ہیں جن کی وجہ سے آنسو نکل آتے ہیں۔ مجید امجد کی تراکیب جو تمثال بناتی ہیں وہ کمال کی ہیں ان پر الگ سے کام ہوتا ہے اور ان کے منابع بھی دریافت کئے جانے چاہئیں۔ صرف دو تراکیب دیکھئے:

فروشِ انبوہِ پابجولاں (مشرق و مغرب)

ہر ترکیب ایک مصرعہ ہے پاؤں میں پڑی ہوئی بیڑیوں کے ہجوم کا شور فریاد، کتنی سکھی تصویر ہے، قیدیوں کا ہجوم ہے جن کے پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں، وہ چلتے ہیں تو بیڑیوں کا شور ہوتا ہے جو فریاد کرتی ہیں اور ان کا دکھ درد مٹاتی ہیں۔ ایک اور ترکیب دیکھئے:

نشیب زینۂ ایام یعنی دلوں کی سیڑھی کا نشیب نیچے اترنا ڈھلتی عمر کی طرف اشارہ ہے۔ شعر دیکھئے، یہ غزل مجید امجد کی بیماری کے دنوں کی غزل ہے۔

پلٹ پڑا یوں شعاعوں کے چیتھڑے اوڑھے
نشیبِ زینۂ ایام پر عصا رکھتا

واپس آ رہا ہوں، شعاعوں کا لباس پہنے جو چیتھڑے ہو گیا ہے۔ عمر کے دنوں کی سیڑھی سے عصا کے سہارے نیچے اتر رہا ہوں۔ کتنی فکر انگیز تمثال ہے۔ انسان کی واپسی شعاع کی صورت یا شعاع کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ یہ تو تراکیب میں تمثال آفرینی ہے۔ مجید امجد کی آخری نظموں میں تمثال آفرینی کا انداز اور اسلوب بھی الگ ہے مثلاً

اوروں کی کیا کہئے، خود میرا دل انگاروں کا مطبخ ہے (حرص)

ان سب لاکھوں کروں زمینوں کے اوپر لمبی سی قوس میں یہ بلوریں جھرنا
جس کا ایک کنارا دوران چھتناروں کے پیچھے روشنیوں کی
ہمیشگیوں میں ڈوب رہا ہے

(ان سب لاکھوں کروں)

ان نظموں میں جو تمثالیں بنتی ہیں وہ گہری سوچ کا نتیجہ ہیں اور نہایت پیچیدہ ہیں جن کا تجربہ مجید امجد کے باطن کو دریافت کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

☆☆☆☆

Scanned with CamScanner

آبی رنگ (واٹر کلر) پینٹنگز کی کہانی

محمد جاوید، مصور

قدرت کی ایجادات خواہ وہ ایک تنکا ہی کیوں نہ ہو اُس کے پیدا کئے ہوئے بندوں کے لئے بے حد مفید ہیں بلکہ یوں کہنا بجا ہوگا کہ انسان کی زندگی کا دارومدار دنیا کی ہر اُس چیز پر ہے جو قدرت نے پیدا کی۔ مکانات، کپڑا اور کھانے پینے کی اشیاء سبھی کے لئے بنیادی سامان یعنی چیزیں تو اُس ذات کی مہیا کردہ ہیں۔ انسانوں نے تو صرف عطا کردہ دماغی قوت سے اِن کے استعمال کے لئے علم حاصل کیا۔ مٹی، پتھر، درخت اور پودے کیا کیا کام نہیں کرتے۔ یہ سب سوچنے پر منحصر ہے۔ حضرت ذہین شاہ تاجی فرماتے ہیں:

حسنِ فطرت ہر جگہ سرمایۂ نظارہ ہے
ذرّہ ذرّہ میری آنکھوں کے لئے گہوارہ ہے
ہائے جو ذرّہ ہے وقف پائمالی، بے خبر!
دیکھئے تو مصحفِ فطرت کا اک سیپارہ ہے

کیا خوب فرمایا بابا صاحب نے۔ کُن فیکون کی صدا نے کائنات تخلیق کر دی۔ اور اللہ کے پیدا کردہ بندوں نے دنیاوی ضروریات کے لئے ایجادات تخلیق کیں۔ ان تخلیقات میں سے مصوری کے لئے رنگ بھی شامل کئے جا سکتے ہیں اور اُن سے تیار کردہ پینٹنگز بھی۔

قدیم زمانوں سے لے کر اَب تک قدرتی رنگین مادے (Pigments) مٹی، پتھر، پودوں، سبزیوں اور دھاتوں سے ہی حاصل کئے جاتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ اِن میں نکھار اور نزاکت پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ رنگین مادوں میں پانی بھی ملایا جا سکتا ہے اور تیل بھی۔ پانی ملانے سے واٹر کلر بن جاتے ہیں اور تیل سے آئل کلر۔ براؤن کلر مٹی سے بنتے ہیں جبکہ نیلا اور گہرا نیلا رنگ نیل نامی (Indego) پودے اور پیپس لازولی (Papis Lazuali) کو پیس کر بنتے ہیں اور سرخ رنگ میڈرز (Madder) نامی پودے سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اسی طرح تمام دوسرے رنگ اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ کسی نہ کسی چیز سے نکلتے ہیں۔ یہ ایک عام سی بات ہے کہ ہم اپنے کام کی چیزیں خریدتے ہیں مگر اِن چیزوں کی بنیاد کو جاننے کی کم ہی کوشش کرتے ہیں۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے غور کریں تو پتہ چلے گا کہ جو کچھ انسانوں کو اپنی زندگی

Scanned with CamScanner

گزارنے کے لئے ملتا ہے' وہ سب اُس پروردگار کی ہی دین ہے خواہ وہ عمارات ہوں یا مشینیں۔

یہ کائنات بڑی رنگ برنگی ہے۔ روشنی کے رنگ' دھوپ اور سائے کے رنگ' صبح اور شام کے رنگ یہ سب مختلف نظر آتے ہیں اور مختلف موسموں میں اِن رنگوں میں تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ مصوروں کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اِن تبدیلیوں کو اپنے کینوس پر سموئیں۔ میڈیم واٹر کلر ہو یا کوئی اور' کھیلنا تو رنگوں سے ہی ہے نا۔

جب رنگوں کا ذکر آتا ہے یا زمین' پہاڑ اور پانی وغیرہ کا تو میں یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ آخر یہ کیسے وجود میں آئے جن کی وجہ سے ہم اس دنیا میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ تخلیق ہے اُس پاک ذات کی جو سب سے افضل اور واحد ہے۔ عام سنتے ہیں کہ رنگ باتیں کرتے ہیں اور یہ صحیح ہے چونکہ رنگوں کا اثر ضرور ہوتا ہے۔ اِن کی تاثیر سمجھ لیں یا زبان' متاثر کئے بغیر نہیں رہتے۔ اِسی لئے تو آج کل رنگوں سے بیماریوں کا علاج بھی کسی حد تک کیا جاتا ہے۔ رنگوں کے ساتھ اشکال کا بھی بڑا اہم کردار ہے۔ آبی رنگ ہوں یا روغنی اِن کا انسان کے ذہن پر کوئی نہ کوئی اثر ضرور ہوتا ہے۔ البتہ مختلف میڈیم کی وجہ سے اثرات میں فرق ہو سکتا ہے۔ آپ عمارتوں کے پینٹ کو دیکھ لیجئے' ڈِس ٹیمپر (Distemper)' ایملشن (Emulsion) اور پلاسٹک ایملشن (Plastic Emulsion) میں بھی بڑا فرق ہے۔ اسی طرح واٹر اور آئل کلرز میں فرق ہو سکتا ہے۔ قدرتی رنگین مادوں (Pigments) میں عربی گوند (Gum Arabic) گلیسرین (Glycerin) وغیرہ اس لئے ملائی جاتی ہے کہ واٹر کلر کاغذ یا کینوس وغیرہ کی اچھی طرح پکڑ کر سکے اور جلدی پھیکا بھی نہ پڑے۔ اِن رنگوں کی تیاری میں دن بدن بہتری لائی جا رہی ہے۔ مارکیٹ میں رنگوں کی ٹکیاں بھی ملتی ہیں اور ٹیوب بھی۔ ٹکیاں تو خشک ہوتی ہیں مگر ٹیوب میں گیلے رنگ ہوتے ہیں جو بہت آسانی سے پانی میں حل ہو جاتے ہیں۔ واٹر کلر کے ایک ہی رنگ کو ہلکا یا گہرا لگایا جا سکتا ہے جبکہ آئیل کلر کے شیڈز بدلنے کے لئے دوسرے رنگ ملائے جاتے ہیں اور تہ در تہ بھی لگائے جاتے ہیں۔ چونکہ رنگوں کے اثرات کا ذکر کیا گیا ہے' اس لئے میں ایک واقعہ جو ستر کی دہائی میں پیش آیا' قلم بند کر رہا ہوں۔ میرے ایک دوست جو انجینئر تھے کہنے لگے کہ مہمان بہت آتے ہیں اور پھر جلدی جاتے بھی نہیں۔ میں نے کہا آپ اپنی مصروفیت کا بتا دیا کریں مگر وہ راضی نہ ہوئے۔ چونکہ وہ بڑے مہمان نواز تھے' لہذا مہمانوں کی ناراضگی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے تجویز دی کہ آپ اپنے ڈرائنگ روم کی دیواروں پر سرخ یا نارنگی رنگ کروا دیں اور اُنہوں نے ایسا ہی کیا۔ جب دوبارہ ملاقات ہوئی تو وہ بڑے خوش نظر آئے۔ اس تجربہ سے یہ ثابت ہوا کہ رنگ اپنا اثر رکھتے ہیں۔

مختصر تاریخی جائزہ

واٹر کلر پینٹنگز کی جڑیں قدیم زمانہ سے ملتی ہیں۔ پتھر کے دور میں (Paleolithic ages) غاروں کی دیواروں پر قدرتی رنگین مادوں (Pigments) میں پانی ملا کر اور کوئلہ وغیرہ سے تصاویر 4000 بی سی کے لگ بھگ بننا شروع ہوئیں جو زیادہ تر سجاوٹی ہوتی تھیں۔ تقریباً چوتھی سنچری میں واٹر کلر کی لینڈ سکیپ پینٹنگز ایشیاء میں بنائی گئیں۔ مصری آرٹ کی پرانی تہذیب میں قدرتی مادوں میں پانی ملا کر پیپرس

Scanned with CamScanner

(Papyrus) پر پینٹ کیا جاتا تھا بلکہ جیسا میں نے 2005ء میں مصر کے دورہ میں دیکھا پیپرس پر اُس وقت بھی کام ہو رہا تھا۔

واٹر کلر کی تاریخ عجیب وغریب ہے۔ آج بھی اس کی اہمیت آئل کلر سے قدرے کم جانی جاتی ہے حالانکہ تاریخی اعتبار سے قدرتی رنگیں مادوں کے آپس میں ملانے سے ہی تمام رنگ پیدا ہوتے ہیں۔ فریسکو پینٹنگز سجاوٹ کے لئے دیواروں اور چھتوں پر بنائی گئیں جو کئی سالوں بعد بھی تازہ لگتی تھیں' مگر اِن کے رنگ محفوظ کرنے کے لئے مختلف محلول استعمال کئے جاتے تھے۔ کلاسیکل زمانے میں یہ پینٹنگز گرجا گھروں (Churches)' مندروں (Temples) اور پبلک کی عمارات کی سجاوٹ کا باعث بنیں۔ نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کے دور میں بھی فریسکو پینٹنگز پسند کی جاتی تھیں۔ اِن پینٹنگز کے رنگ پانی ملا کر ہی بنتے تھے۔

یورپین مصوروں نے پندرھویں اور سولھویں صدی میں دیواروں پر خود ساختہ رنگوں میں پانی ملا کر ہی پینٹنگز بنائیں۔ نشاۃ ثانیہ کے دور میں واٹر کلر کے لئے قدرتی مادوں سے تیار کردہ رنگوں کے ساتھ ساتھ کاغذ بھی تیار ہوئے۔ مصور البرٹ ڈیورر (1471-1525 Albrecht Durer) جو پودوں اور پرندوں کی تصاویر بناتا تھا' نے واٹر کلر استعمال کرنے کے لئے نئے نئے تجربات کئے۔ خاص طور پر کاغذ پر رنگوں کی شفافیت کو اجاگر کرنا اور کسی خاص حصہ میں روشنی دکھانا وغیرہ وغیرہ۔ اس سوچ کی بنا پر ہنز بول (1471-1513 Hans Bol) نے جرمنی میں واٹر کلر پینٹنگز کے ایک سکول کی بنیاد رکھی۔ اِس کے باوجود یہ میڈیم زیادہ نہ پنپ سکا اور سکیچنگ کی حد تک محدود ہو گیا اور صرف السٹریشن (Illustration)' نقشہ جات' کارٹون اور ڈیزائن وغیرہ کے لئے استعمال کیا جانے لگا۔

واٹر کلر کا میڈیم اٹھارویں صدی میں مغرب میں قدرے اُس وقت آگے بڑھا جب پال سینڈ بائی (1730-1809 Paul Sandby) جو نقشہ جات بناتا تھا اور رائیل اکیڈمی کا فاؤنڈر بھی تھا' نے واٹر کلر میں لینڈ سکیپ بنائیں۔ اِس تحریک کے رکن جے ایم ڈبلیو ٹرنر (1775-1851 J.M.W Turner) نے واٹر کلر استعمال کرتے ہوئے بڑی خوبصورت لینڈ سکیپ بنائیں اور مختلف ترکیبوں کے تجربات کئے۔ 1804ء میں واٹر کلر پینٹنگز کی ایک سوسائٹی بھی یورپ میں قائم ہوئی اور 1832ء میں ایک اور سوسائٹی بنی۔ اِس کا ایمپریشنسٹ (Impressionist) مصوروں نے بڑا اثر لیا اور انیسویں اور بیسویں صدیوں میں یہ میڈیم کئی ایک مصوروں نے اپنایا' مگر زیادہ تر وائلڈ لائف اور السٹریشن کے موضوع میں ہی استعمال ہوا۔ ایمپریشنسٹ مصور پال سیزاں (1839 - 1906 Paul Cezanne)' وِنسینٹ وین گاف (1853 - 1890 Vincent Van Gagh)' وسلی کنڈنسکی (1866 - 1944 Wassily Kandinsky) جرمن پینٹر اور پال کلی (1879 - 1940 Paul Klee) سویزرلینڈ کے مصوروں نے بھی اِس میڈیم میں کام کیا۔

مناسب ہوگا کہ یہاں پوسٹر کلر اور گاش (Gouache) کا ذکر کر دوں۔ یہ رنگ بھی خاصے پرانے ہیں اور پانی کے ساتھ ہی استعمال کئے جاتے ہیں۔ مگر یہ غیر شفاف (Opaque) تاثر رکھتے ہیں یعنی پہلے لگے ہوئے رنگ پر اگر کوئی دوسرا رنگ لگا دیا جائے تو پہلے والا رنگ چھپ جائے گا۔ ایسے رنگ فریسکو پینٹنگز میں کسی حصہ کو نمایاں کرنے کے لئے بھی لگائے جاتے تھے۔ آج بھی یہ رنگ خاصے استعمال ہوتے

Scanned with CamScanner

ہیں۔ پانی زیادہ ملادیں تو یہ واٹر کلر کی طرح بن جاتے ہیں' مگر اس میں باریک باریک ذرّے نظر آتے رہتے ہیں۔ ٹیمپرا پینٹنگز بھی ایجاد ہوئیں اِن کے لئے رنگوں میں انڈے کی زردی اور تیل وغیرہ ملایا جاتا تھا جس کی وجہ سے یہ دیرپا رہتی تھیں۔

چودھویں صدی سے اٹھارویں صدی تک چین اور جاپان میں واٹر کلر پینٹنگز کا بڑا عروج تھا' مگر آئیل کلر کی ایجاد کے بعد واٹر کلر کا استعمال بہت کم ہو گیا اور مصوروں نے واٹر کلر میں چھوٹے سکیچ بنانا شروع کر دیئے جو بڑی پینٹنگز بنانے میں اُن کی مدد کرتے تھے۔ مغربی مصور پیٹر پال رُبن (Peter Paul Rubens 1599-1640) اور انتھونی وین ڈائیک (Anthony Van Dyck 1599 - 1641) بھی واٹر کلر میں چھوٹے سکیچ یعنی نمونے بناتے رہے۔ اسی طرح تھامس گینسبرا (Thomas Gainsberaugh 1727 - 1788) اور جان کانسٹیبل (John Constable 1776-1877) واٹر کلر کو سٹڈی کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ یوں مغربی ممالک میں واٹر کلر کا عروج اور زوال رہا۔

پاکستان

پاکستانی واٹر کلر کی تاریخ کی طرف اگر دھیان کریں تو ہمیں زیادہ لکھا ہوا مواد نہیں ملتا چونکہ نہ تو کسی نے یہاں رنگ کو بنایا اور نہ ہی کھوج لگانے کی کوشش کی۔ البتہ میں نے نیشنل کالج آف آرٹس میں طالب علمی کے زمانہ میں منی ایچر پینٹنگز کے استاد حاجی محمد شریف کو رنگ پیستے دیکھا۔ وہ بطور کورٹ پینٹر کے بھی کام کر چکے تھے اس لئے چند رنگ پتھروں سے اپنی پینٹنگز کے لئے تیار کرتے تھے۔ منی ایچر پینٹنگز میں واٹر کلر ہی استعمال کیا جاتا ہے مگر اُن رنگوں کا تاثر شفاف نہیں ہوتا۔ وصلی بھی وہ خود تیار کرتے اور ہمیں بھی سکھاتے تھے۔ یہ 1957ء تا 1962ء کی بات کر رہا ہوں۔ اُس وقت واٹر کلر اور پوسٹر کے رنگ بازار سے ملتے تھے۔ البتہ ایکریلک (Acrylic) رنگ نہیں ہوتے تھے۔ چار پانچ سال پہلے پیکجز لمیٹڈ نے پوسٹر اور واٹر کلر بنانے کے تجربات شروع کئے اور مجھے بطور نمونہ ملے' مگر جب میں نے استعمال کرنے کی کوشش کی تو نہایت ناقص نکلے کیونکہ کاغذ پر ذرات نظر آتے تھے اور برش صحیح انداز میں چلتا بھی نہیں تھا۔ شاید اسی لئے مارکیٹ میں وہ رنگ نہیں پھیلے۔

کالج میں واٹر کلر میڈیم کے متعلق باقاعدہ پڑھایا نہیں جاتا تھا بلکہ اب بھی یعنی 2018 تک کسی تعلیمی ادارے میں یہ مضمون کے طور پر ابھر کر سامنے نہیں آیا۔ جس سے واٹر کلر کی اہمیت وافادیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ہمارے ایک استاد محمد لطیف چغتائی نے ایک دو مرتبہ ہمیں بلایا اور واٹر کلر میں برش کو ڈبو کر ڈرائنگ کاغذ پر اس انداز سے ایک سٹروک (جنبش) لگایا کہ ایک خوبصورت پرندہ بن گیا۔ اُس میں ہلکا اور گہرا رنگ ایک جنبش اور ایک ہی رنگ سے پیدا ہو گیا۔ ہم سب حیران ہو گئے۔ مگر اس میڈیم کے متعلق پڑھایا نہیں جاتا تھا یعنی اِس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ شاید اس لئے کہ اکثر کاغذوں کا رنگ وقت کے ساتھ ساتھ بدل جاتا ہے جو واٹر کلر کے شیڈ کو متاثر کرتا ہے۔ واٹر کلر بذاتِ خود بھی پھیکا پڑ سکتا ہے۔ نیشنل کالج آف آرٹس میں میرے دو اور ٹیچر نیاز علی شاہ بخاری اور استاد بشیر الدین تھے جو واٹر کلر سے السٹریشن بنایا کرتے تھے۔ واٹر کلر میڈیم کو کہ مصوری کی تعلیم کے نصاب کا حصہ نہ پہلے تھا اور نہ اب ہے مگر گنے چنے مصور اِس میڈیم میں کام کرتے ہوئے ضرور نظر آئیں گے۔ اُن میں

Scanned with CamScanner

سے چند ذاتی طور پر طلبا کو سکھاتے ہیں یا پھر غیر منظور شدہ آرٹ اکیڈمیوں میں سکھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ علامہ اقبال کیا خوب کہتے ہیں:

کچھ اور ہی نظر آتا ہے کاروبارِ جہاں
نگاہ شوق اگر ہو شریکِ بینائی
نگاہ شوق میسر نہیں اگر تجھ کو
تیرا وجود ہے قلب و نظر کی رسوائی
(ضربِ کلیم)

انسان کے لئے کوئی کام مشکل نہیں بشرطِ کہ وہ علم اور شوق رکھتا ہو۔ محنت اور لگن کامیابی کا راستہ دکھاتی ہے۔ فنِ مصوری کے لئے ریاضت بے حد ضروری ہے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش جاری رہنا چاہیے۔

ہمارے یہاں یعنی اس خطہ کی مصوری کی جڑیں ہمارے آثارِ قدیمہ سے جا ملتی ہیں۔ انڈس ویلی، موہنجوداڑو، ٹیکسلا اور ہڑپہ جیسی تہذیبیں ہمارے سامنے ہیں۔ اجنتا اور ایلورا کی غاروں میں بنائی گئی پینٹنگز کا اثر بھی نمایاں ہے۔ یہ تقریباً 4000 بی سی کے پرانے آثارِ قدیمہ ہیں، جنہوں نے مصوروں اور کاریگروں کو راستہ دکھایا۔ پھر سکھوں اور انگریزوں کی حکومتوں نے اپنے کلچر کے اثرات چھوڑے۔ مغلیہ دور میں مصوری نے بڑا عروج پایا کیونکہ مغل بادشاہوں نے مصوروں کو اچھے معاوضے پر دربار میں رکھا اور اُن سے خاصہ کام کروایا۔ اِن کا دور 1526ء سے 1707ء تک رہا۔ ہمایوں ایران سے واپسی پر بہزاد کے دو شاگرد خواجہ عبدالصمد اور میر سید علی کو ساتھ لے آیا تھا۔

خاص طور پر اکبر بادشاہ کے دور میں مصوری کو بڑی ترقی حاصل ہوئی۔ بادشاہ ہمایوں نے اُن دو ایرانی مصوروں سے داستان امیر حمزہ کے لئے مصوری کروائی اور انہوں نے تقریباً 1400 تصاویر بنائیں۔ اس نسخے کی 12 جلدیں تھیں۔ 1400 میں سے صرف 85 تصاویر مغربی عجائب گھروں میں موجود ہیں، افسوس کہ باقی تمام غائب ہیں۔ اس دور میں مصوری پر ہندوستانی اور ایرانی مصوری کا بڑا اثر تھا۔ اکبر بادشاہ نے بھی مصوروں سے کتب کے لئے تصاویر بنوائیں۔ مثلاً اکبرنامہ، آئینِ اکبری، تزک بابری، تزکِ جہانگیری، منتخب التواریخ اور طبقاتِ اکبری وغیرہ جن کے لئے عمدہ مصوری کی گئی۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ پینٹنگز بھی واٹر کلر میں بنائی گئی تھیں، چونکہ کتابوں کے لئے السٹریشن زیادہ تر واٹر کلر سے ہی بنائی جاتی تھیں۔ منی ایچر پینٹنگز مغلوں کے دور سے ہی چلی آ رہی ہیں اور آج تک یہ مضمون پڑھایا بھی جا رہا ہے۔ حاجی محمد شریف (جو میو سکول آف آرٹس اور بعد میں نیشنل کالج آف آرٹس میں اِس شعبہ کے ہیڈ تھے) نے اِس فن کو پاکستان میں زندہ رکھا۔

پاکستان بننے کے بعد میو سکول آف آرٹس کے چند اساتذہ واٹر کلر میں کام کرتے تھے۔ البتہ عبدالرحمٰن چغتائی صاحب نے واٹر کلر میں ہی اپنا نام بنایا اور اُن کے فن پارے بڑے مشہور ہوئے جن کی آج بھی بڑی مانگ ہے۔ واش تیکنیک میں کام کرتے تھے یعنی رنگ لگا کر کاغذ کو دھو دینا پھر رنگ لگانا اور یہ عمل بار بار کرنا، جس کی وجہ سے اُن کی پینٹنگز کے رنگ کاغذ میں کافی حد تک جذب ہو جاتے تھے اور اُن میں تبدیلی کا

Scanned with CamScanner

امکان بھی کم ہوتا تھا۔ زین العابدین جو بنگالی آرٹسٹ تھے' بھی واٹر کلر میں کام کرتے تھے۔ دراصل بنگال سکول آف آرٹ میں آبی رنگوں کے میڈیم میں کام کیا جاتا تھا۔ عبدالرحمٰن چغتائی کا نام بھی بنگال سکول کے مصوروں میں آتا ہے اور اگر غور کیا جائے تو ان کی پینٹنگز ابندرا ناتھ ٹیگور (1871-1951) جو رابندرا ناتھ ٹیگور کا بھتیجا اور بنگال سکول کا سرکردہ تھا' کی پینٹنگز سے خاصی مماثلت رکھتی ہیں۔ بنگال سکول پینٹنگز کو ہندوستانی پینٹنگز بھی کہا جاتا تھا کیونکہ یہ تحریک مذہبی عقائد پر شروع ہوئی۔ اس سٹائل کو کلکتہ کالج آف آرٹس کے پرنسپل ای بی ہیول (E.B.Havell) کی اشیر باد حاصل تھی۔ کلکتہ سکول میں طالب علم مغل مصوری کی کاپی کرتے تھے۔ جس کے رنگوں میں پانی ہی ملایا جاتا تھا۔ ہمارے ہاں بھی اس کا خاصہ اثر ہوا یہاں تک کہ آج بھی کراچی کے چند مصور بنگال سکول سے متاثر ہیں۔ وہ سمندر' کشتیاں اور لینڈ سکیپس بناتے ہیں۔ پورٹریٹ اور فگرز بھی بنائی جا رہی ہیں۔

کہتے ہیں کہ واٹر کلر بڑا مشکل ہے' بس جو رنگ لگ گیا وہ بدل نہیں سکتا لیکن اگر دوسری طرف دیکھا جائے تو ایک ہی رنگ کے ایک ہی سٹروک (جنبش) سے مختلف شیڈز با آسانی پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ جتنی تہیں آئیل کلر کی لگ سکتی ہیں واٹر کلر میں نہیں لگائی جاتیں۔ مطلب یہ کہ وہ گہرائی جو آئل میں پیدا کی جا سکتی ہے وہ واٹر کلر میں شائد نہیں آ سکتی اور پھر فن پارے کی زندگی کا سوال بھی ہے۔ دراصل واٹر کلر تیز اور جلدی کا میڈیم ہے اس لئے مصور اپنے پسندیدہ منظر کے موقع پر صرف سکیچ بناتے تھے تا کہ اُن کو آئل کلر سے پینٹنگ بنانے کے لئے رنگ اور منظر یاد رہیں۔ جے ایم ڈبلیو ٹرنر نے واٹر کلر میں "40 x "27 سائز میں گلیشر اینڈ سورس آف دی ایوران (Glacier and Source of the Aveyron) پینٹنگ بنائی جو خاصہ بڑا سائز ہے۔ میرا خیال ہے چغتائی صاحب نے انیسویں و بیسویں صدیوں میں بھی اتنے بڑے سائز پر کام نہیں کیا۔ ہمارے اساتذہ بتایا کرتے تھے کہ واٹر کلر سکیچنگ کے لئے ہے یا کتابوں کی السٹریشن اور تصاویر بنانے کے لئے' شاید اسی لئے یہ میڈیم نصاب کا حصہ نہیں بن سکا۔

آئل کلرز کا استعمال دنیا بھر میں بہت زیادہ ہے اور اب ایکریلک (Acrylic) رنگوں سے بھی کام کیا جاتا ہے۔ اِن میں بھی پانی ہی ملایا جاتا ہے چونکہ یہ بڑی جلدی خشک ہو جاتا ہے۔ اس لئے مصور کو جلدی کام کرنا پڑتا ہے۔ اس رنگ سے زیادہ تر وہ مصور کام کرتے ہیں جن کو آئل کے رنگوں سے الرجی ہوتی ہے۔ بہر حال ایکریلک ایک باقاعدہ میڈیم کے طور پر ابھر کر سامنے آیا ہے۔ اگر آپ نظر دوڑائیں تو واٹر کلر میں کام کرنے والے گنتی کے مصور نظر آئیں گے۔ صرف ہمارے ملک میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں۔ اگرچہ آئل کلرز کی ایجاد کے بعد واٹر کلر کا میڈیم خاصہ پیچھے چلا گیا ہے' پھر بھی یہ میڈیم ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ کئی ایک واٹر کلر سوسائٹیاں بن چکی ہیں جو گاہے بگاہے نمائشوں کا اہتمام کرتی رہتی ہیں۔

واٹر کلر کی چند ترکیبیں

واٹر کلر میں تصاویر بنانے کے لئے برش' کاغذ' ڈرائینگ بورڈ اور رنگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ برش کے مختلف سائز گول اور چپٹے

Scanned with CamScanner

بازار میں ملتے ہیں' مگر اچھی قسم کے خریدنے چاہئیں۔ڈرائینگ شیٹس موٹی اور مناسب ٹیکسچر والی خریدنی چاہییں۔ عام طور پر وائٹس مین کی شیٹس استعمال ہوتی ہیں۔اب ہاتھ کے بنے ہوئے بہت عمدہ موٹے کاغذ بھی دستیاب ہیں۔موٹے کاغذوں میں سلوٹیں نہیں پڑتیں۔واٹرکلر کی ٹکیاں بھی ملتی ہیں اور ٹیوبوں میں بھی آتے ہیں۔آرٹسٹ کوکوالٹی کے رنگ استعمال کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔البتہ طالب علم عام رنگ استعمال کر سکتے ہیں۔آرٹ میٹریل پر اکثر دھیان نہیں دیا جاتا جونقصان دہ ہے۔لہٰذا ایک مصور کے لئے یہ ضروری ہے کہ آرٹ میٹریل خریدتے وقت خصوصی توجہ دے۔

کاغذ چسپاں کرنا

سب سے پہلے کاغذ کو ڈرائنگ بورڈ پر چسپاں کیا جاتا ہے۔کاغذ کو فوم یا روئی سے ہلکا سا گیلا کر کے بورڈ پر رکھ کر چاروں طرف گوند والی ٹیپ لگا دی جاتی ہے اور جب کاغذ خشک ہو جاتا ہے تو وہ تن جاتا ہے اور اُس میں کسی قسم کی سلوٹ نہیں پڑتی۔واٹرکلر استعمال کرنے کے بعد بھی کاغذ کی بناوٹ بالکل صحیح رہتی ہے۔ہاں اگر کاغذ موٹا ہو تو پھر چپکانے کی ضرورت نہیں ہے۔جو چیز بنانی مقصود ہو' پنسل کی ہلکی لائینوں سے اس کی ڈرائنگ کی جاتی ہے' مگر شرط یہ ہے کہ واٹرکلر کرنے کے بعد پنسل کے نشان نظر نہ آئیں۔

ویٹ آن ویٹ (Wet on wet)

اِس ترکیب میں ڈرائنگ شیٹ کو ہلکا گیلا کر لیا جاتا ہے یا نمی دی جاتی ہے اور پھر رنگوں سے کام کیا جاتا ہے۔خاص طور پر جب رنگ پھیلانا مقصود ہوں تو پھر یہ بہت اچھی ترکیب ہے۔ڈرائنگ بورڈ کو ٹیڑھا کرنے سے رنگ پھیلایا جا سکتا ہے تاکہ دلچسپ ٹیکسچر اور ڈیزائن پیدا ہو جائے۔کاغذ کے خشک ہونے کے بعد مزید خدوخال نکالے جا سکتے ہیں۔اس طرح پینٹنگز بننے میں دیر بھی نہیں لگتی۔

قلم اور آبی رنگ (Pen & water colour)

کاغذ پر پہلے ڈرائنگ پین کے ساتھ کی جاتی ہے اور بعد میں واٹرکلر ضرورت کے مطابق بھر دیئے جاتے ہیں۔ویسے واٹرکلر کرنے کے بعد جب خشک ہو جائے تو پھر پین سے ڈرائنگ کرنا مناسب ہوگا چونکہ وہ پھیلے گا نہیں۔کتب کے لئے السٹریشن بھی ایسے ہی کی جاتی ہیں۔

خشک برش (Dry Brush)

اس ترکیب میں خشک کاغذ پر مہارت کے ساتھ واٹرکلر کے سٹروکس لگائے جاتے ہیں جو کم اور زیادہ بھی کئے جا سکتے ہیں۔کہیں رنگ زیادہ چھوڑا جاتا ہے اور کہیں کم۔اِس تیکنیک میں ٹیکسچر بھی پیدا کیا جا سکتا ہے۔

Scanned with CamScanner

کاغذ کو دھونا (Wash Technique)

اِس ترکیب میں کاغذ پر رنگ لگا کر دھو دیا جاتا ہے اور پھر رنگ لگا کر دوبارہ دھو دیتے ہیں۔ یہ عمل بار بار کرنے سے رنگ کاغذ میں کافی حد تک جذب ہو جاتا ہے۔ رنگوں کے واش دینے سے عمدہ پینٹنگ بنائی جا سکتی ہے۔ واش ہلکے رنگ سے شروع کرنا چاہیئے اور پھر بتدریج گہرے رنگ لگائے جاتے ہیں۔

ہائی لائٹس (Highlights)

کوئی پینٹنگ گہرے اور ہلکے رنگوں کے بغیر مکمل نہیں کی جا سکتی۔ واٹر کلر میں کاغذ کا اصلی رنگ مہارت کے ساتھ مختلف جگہوں پر ضرورت کے مطابق چھوڑا جاتا ہے جو ہائی لائٹس کا کام کرتا ہے اور پینٹنگ کو اجاگر کرنے میں مدد دیتا ہے۔ ہائی لائٹس لگانے کے لئے ایک ربر نما پلاسٹر (Masking Fluid) بھی آتا ہے۔ اُس کو کاغذ پر ضرورت کے مطابق لگایا جاتا ہے اور رنگ لگانے کے بعد اِس پلاسٹر کو ہٹا دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے سفید کاغذ رہ جاتا ہے۔ یہ مصور پر منحصر ہے کہ وہ کہاں اِس کو استعمال کرنا چاہتا ہے۔ روئی سے بھی رنگ کو پینٹنگ سے اُٹھایا جا سکتا ہے۔ اگر کاغذ پر موم لگا دی جائے تو بھی وہاں رنگ اثر نہیں کرتا۔ واٹر کلر پینٹنگ بننے کے بعد بھی اگر مصور اس کا کوئی حصہ ہلکا کرنا چاہتا ہے تو وہ روئی اور پانی سے کیا جا سکتا ہے۔

ٹیکسچر پیدا کرنا

جدید پینٹنگ کے لئے ٹیکسچر کی حیثیت بہت اہم ہے۔ یہ کپڑے، کاغذ، تولیہ، ٹشو پیپر اور درختوں کے پتوں وغیرہ سے بنایا جا سکتا ہے۔ ان چیزوں کو رنگ میں بھگو کر کاغذ پر لگانے سے مختلف ٹیکسچر بلکہ پیٹرن بن جاتے ہیں۔ کاغذ پر پیپر پن مختلف جگہ پر لگانے سے بھی ٹیکسچر پیدا ہو جاتا ہے۔ فن کی ریاضت کچھ نہ کچھ ضرور سکھا دیتی ہے۔

میری نظر سے ایک کتاب گزری جس میں واٹر کلر سے کام کرنے کے سو سے زائد فنی عملیات، ترکیبیں یا اشارے بتائے ہوئے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں یہ مصور پر منحصر ہے کہ وہ کتنے تجربات کرتا ہے۔ واٹر کلر کو ایک دوسرے میں ملایا بھی جا سکتا ہے اور اس پر ڈرائینگ بھی کی جا سکتی ہے۔ علاوہ ازیں پانی میں حل ہونے والے رنگ بھی ملائے جا سکتے ہیں۔ خاص طور پر السٹریشن یا کتب کے لئے تصویر کشی کرنے کے لئے غیر شفاف رنگ استعمال ہوتے ہیں۔ اِس لئے واٹر کلر کو فنونِ متعارفہ کا حصہ کہا جا سکتا ہے۔ ہمارے ہاں صرف شفاف رنگوں کا استعمال پسند کیا جاتا ہے۔ مگر السٹریشنز وغیرہ کرتے وقت کوئی بندش نہیں ہوتی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے واٹر کلر تجرباتی میڈیم ہو۔ انسان کی دماغی قوت کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ وہ اپنے دماغ اور وجدان کو بروئے کار لاتے ہوئے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ یہ قدرت کی عنایت ہے جس نے کائنات تشکیل دی اور وہ ہر چیز پر قادرِ مطلق ہے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں:

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

Scanned with CamScanner

یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ شعر فن کار کی انفرادیت اور منفرد انداز کے بارے کہا گیا ہو چونکہ انسان اِس دنیا میں بہت کچھ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ شاید اسی لئے شاعرِ مشرق نے ہر فرد کو بغیر کسی تفریق کے ملت کے مقدر کا ستارہ کہا ہے۔ جبکہ مصور کو تو اپنے فن پاروں میں کچھ نہ کچھ تخلیق کرنا مقصود ہوتا ہے۔ میڈیم یعنی واٹر کلر، آئل کلر، پیسٹل اور اکریلک وغیرہ تو اظہار کا ذریعہ ہیں جو اپنی اپنی کوالٹی کی وجہ سے مختلف اہمیت کے حامل ہیں۔

انشاءاللہ موقع ملا تو موجودہ واٹر کلر مصوروں کے بارے بعد میں لکھوں گا۔

حوالہ جات

1- Painter's Progress by Ian Simpson
2- آیاتِ جمال از ذھین شاہ تاجی
3- ضربِ کلیم عہدِ حاضر از پروفیسر محمد رمضان زاہد
4- A World History of Art by Hugh Honour & John Fleming
5- History of Watercolour Paintings - Wikipeida
6- نقوشِ اقبال از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
7- فنونِ لطیفہ۔ زینہ بہ زینہ از نوشابہ الیاس

Scanned with CamScanner

"نسیما! جانبِ بطحا گزر کُن"

محمد ظفر الحق چشتی

عشّاق کو ہمیشہ کسی ایسے قابلِ اعتماد اور قابلِ اعتبار قاصد کی تلاش رہی ہے جو اُن کے جذبۂ صادق کو اُن کے محبوب تک پہنچا دے۔ اس سلسلے میں اُنہیں کہاں تک کامیابی نصیب ہوئی؟ اس سوال کا جواب شاید آتش کے اس شعر میں موجود ہے:

پیام بر نہ میسّر ہوا تو خوب ہوا
زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

اور حُسنِ ازل کے عاشقوں نے اس رسمی قسم کے قاصدوں کی ضرورت و اہمیت سے بالکل ہی انکار کر دیا کیونکہ وہ معاملۂ عشقِ حقیقی میں کفایت کر ہی نہیں سکتے جیسا کہ خواجہ میر درد نے کہا ہے:

قاصد نہیں یہ کام ترا اپنی راہ لے
اُس کا پیام دِل کے سِوا کون لا سکے

یہاں مجھے ایک فارسی اُستاد کا شعر بھی یاد آرہا ہے:

بے واسطۂ گوش و لب از راہِ دل و چشم
بسیار سخن بود کہ گفتیم و شنیدیم

غرض میرا موضوع محبوبِ حجازی، اُن کے عشّاق اور اُن کے قاصد کے حوالے سے ہے۔ اس مضمون کا عنوان مولانا جامیؒ کا ایک مصرعہ ہے۔ شعر یوں ہے:

نسیما جانبِ بطحیٰ گزر کُن
ز احوالم محمدؐ را خبر کُن

جامی کو محبوبِ حجازی کی بارگاہ میں حالِ دِل پہنچانے کے لیے کسی قاصد کی ضرورت ہوئی تو اُس پر یہ رازِ حقیقت کھلا کہ کوئی رسمی قاصد اُس بارگاہ تک رسائی کا اہل اور قابل نہیں ہے۔ اور وہاں کسی ایسے قاصد کی ضرورت ہے جو لطیف ہو، پاکیزہ ہو، مطہر ہو، مادی

Scanned with CamScanner

آلائشوں سے پاک ہو اور زمانی مکانی قیود سے آزاد ہو، کوئی ایسا قاصد ہو جس کے گزرنے کی آہٹ بھی اُس ادب گاہ میں سنائی نہ دے، جس کا لہجہ اور انداز گفتگو الفاظ کی ثقالت سے مبرّا ہو، جو خوشبو کی زبان سے کلام کر سکے۔ چنانچہ جامی اور اُس گروہ کے دیگر عشّاق نے نسیم وصبا کو اپنا قاصد بنایا ہے۔

جامی کے کلام میں نسیم وصبا کو قاصد بنانے کی متعدّد مثالیں ملتی ہیں لیکن یہاں میں صرف اسی ایک شعر پر اکتفا کر رہا ہوں کیونکہ مطالعہ صرف جامی کا نہیں بلکہ نسیم وصبا کو قاصد بنانے کی روایت اصل موضوع ہے۔

خواجہ حافظ شیرازی کہتے ہیں:

صبا بہ لُطف بگو آں غزالِ رعنا را
کہ سر بہ کوہ و بیاباں تو دادۂ ما را
بہ شُکر آں کہ تُوئی بادشاہِ کشورِ حُسن
بیاد آر غریباں دشت و صحرا را

(اے بادِ صبا بڑی نرمی سے اُس نازنیں ہرن سے کہہ دے کہ تُو نے ہی ہمارا سر کوہ و بیاباں کے حوالے کر دیا ہے۔ اس بات کے شکرانے کے طور پر کہ تُو ہی مملکتِ حُسن کا بادشاہ ہے، دشت وصحرا کے اِن غریبوں کو یاد رکھ۔)

مولانا حالی نے "مقدّمہ شعر وشاعری" میں خواجہ حافظ شیرازی کے اس اسلوب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اوّل تو صبا کی طرف خطاب کرنا جس میں یہ اشارہ ہے کہ کوئی ذریعہ دوست تک پیغام پہنچانے کا نظر نہیں آتا۔ ناچار صبا کو یہ سمجھ کر پیغام بر بنایا ہے کہ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتی ہے۔ شاید دوست تک بھی اس کا گزر ہو جائے گویا شوق نے ایسا از خود رفتہ کر دیا ہے کہ جو چیز پیغام بر ہونے کی قابلیت نہیں رکھتی اس کے ہاتھ پیغام بھیجتا ہے اور جواب کا امید وار ہے۔ پھر معشوقِ حقیقی کو جس کی ذات بے نشان ہے بطور استعارہ کے غزالِ رعنا کے ساتھ تعبیر کرنا جس سے بہتر استعارہ نہیں ہو سکتا اور پھر اس کی طلب کو غزالِ رعنا کی مناسبت سے کوہ وبیاباں میں پھرنے سے تعبیر کرنا اور پھر باوجود ضمیر متّصل کے جو کہ دادہ میں موجود تھی ضمیر مخاطب منفصل یعنی لفظ "تو" اضافہ کرنا جس سے پایا جائے کہ تیرے سوا کوئی شے ہماری اِس سرگشتگی کا باعث نہیں ہے اور چونکہ پیغام شکایت آمیز تھا اس لیے صبا سے درخواست کرنی کہ بہ لطف بگو یعنی نرمی اور ادب سے یہ پیغام دینا تاکہ شکایت ناگوار نہ گزرے۔"

Scanned with CamScanner

نسیم وصبا کو قاصد بنانے کی روایت کہاں اور کب شروع ہوئی اس کا حتمی جواب شاید کوئی نہ دے سکے لیکن میری معلومات کے مطابق نعت میں اس روایت کی بنیاد سیّدنا امام زین العابدینؑ کے اس استغاثے سے ہوتی ہے:

اِن نِلتَ یا رَوحَ الصَّبَا یَوماً اِلیٰ اَرضِ الحَرَم
بَلِّغ سَلَامِی رَوضَۃً فِیھَا النَّبِیُّ المحترم

(اے بادِ صبا اگر تیرا گزر حرم کی سرزمیں کی طرف ہو تو میرا سلام اُس روضۂ اقدس تک پہنچا جس میں نبیؐ محترم تشریف فرما ہیں۔)

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ دہلوی نے امام زین العابدینؑ کے اسی استغاثے سے استفادہ کرتے ہوئے یوں عرض کیا ہے:

فَیَا رِیحَ الصَّبَا عَطفاً وَّرِفقاً
اِلیٰ ذَاکَ الحِمٰی بَلِّغ سَلَامِی

(اے بادِ صبا ازراہِ لطف وکرم میرے اُس حامی ومددگار تک میرا سلام پہنچا دے۔)

نسیم وصبا کو قاصد بنا کر بارگاہِ رسالتؐ مآب میں اپنا سلام بھیجنا، حالِ دِل بیان کرنا، استغاثہ بیان کرنے اور اپنے ذوق وشوق، عشق و محبّت اور سوز وگداز کا اظہار کرنے کی ان گنت مثالیں عربی، فارسی، اُردو اور پنجابی شاعری میں نظر آتی ہیں۔ مختلف عاشقوں کے مختلف رنگ اور مختلف کیفیتیں ہیں، چند ایک کا ذکر کیا جاتا ہے:

صبا بسوئے مدینہ رو کن، ازیں دعا گو سلام برخواں
بگردِ شاہِ مدینہؐ گردد بصد تضرّع پیام برخواں

(نظام الدّین اولیاء محبوبِ الٰہی)

اے بادِ صبا کملی والے سے جا کہیو پیغام مرا
قبضے سے اُمّت بیچاری کے دیں بھی گیا دنیا بھی گئی

(علامہ اقبالؒ)

علامہ اقبالؒ خاکِ کربلا تک اپنے اشک بھیجنے کے لیے بادِ صبا کو قاصد بناتے ہوئے کہتے ہیں:

Scanned with CamScanner

اے صبا ای پیکِ دُور افتادگاں
اشکِ ما برخاکِ پاکِ اُو رساں

عبدالعزیز خالد بادِ صبا کے ذریعے اپنا سلام سوئے طیبہ بھیجتے ہوئے عرض کرتے ہیں:

سُوئے طیبہ جب گزر ہو تیرا اے بادِ وزاں
ذاتِ پاکِ شاہِ گیہاں را سلامِ من رساں

پنجابی شعراء کے ہاں بھی نسیم وصبا کو قاصد بنا کر مدینے بھیجنے اور اپنا احوال سنانے کی واردات مختلف رنگوں میں دکھائی دیتی ہے، مثلاً:

صبا روضے رسول اللہ دے جائیں
میرا احوال رو رو کے سنائیں
(مولوی غلام رسولؒ)

نسیما قاصدا نہ دیر لائیں
بوجہ اللہ ماہی دے دیس جائیں
(پیر مہر علیؒ شاہ صاحب)

آکھیں سوہنے نوں وائے نی جے تیرا گزر ہووے
میں مر کے وی نئیں مرداجے تیری نظر ہووے
(محمدؐ علی ظہوری)

یہاں تک تو نسیم وصبا کو قاصد بنا کر اپنا احوالِ دل بیان کرنے اور سلام بھیجنے کی روایت کا ذکر ہو رہا تھا۔ عاشقانِ مصطفیٰ ﷺ کی شاعری میں نسیم وصبا کے ساتھ معاملات کا ایک یہ پہلو بھی نظر آتا ہے کہ نسیم وصبا سے مدینہ اور سلطانِ مدینہؐ کا ذکر بھی سنا جاتا ہے اور جب مدینے کی ہوا آتی ہے اور مدینے کی خبریں سناتی ہے تو عاشقوں پر عجیب وارفتگی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے عربی زبان کے دو اشعار کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ان اشعار کے خالق شیخ حسین دجانی ہیں:

Scanned with CamScanner

اِذھَبتَ الاریاح مِن نحو طیبہ
اھاج فوادی طیبہا وھبو بہا
فلا تعجبو من لو عبتی و صبا بتی
ھوی کُلّ نفس اَینَ حل حبیبہا

(مدینہ کی ہوائیں آتی ہیں تو اُن کی خوشبو اور اُن کا چلنا میرے دل میں ہیجان پیدا کر دیتا ہے۔ آپ لوگ میری شیفتگی اور اضطراب پر تعجب کیوں کرتے ہو۔ ہر شخص کا دل وہیں اٹکا ہوا ہوتا ہے جہاں اُس کے محبوب کا ڈیرا ہو۔)

اِس مضمون کے ضمن میں فارسی اور اُردو شعرا کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

اے باد بوئے یار بدیں مبتلا رساں
دَر چشم من ز خاکِ درش تو تیار ساں

(اے ہوا محبوب کی خوشبو مجھ مصیبت کے مارے تک پہنچا، اُس کی چوکھٹ کی مٹی کا سُرمہ میری آنکھ تک پہنچا۔)

اے بادِ صبح دم خبرِ آشنا بیار
بوئے نہفتہ زاں صنم دل ربا بیار

(اے صُبح کی ہوا دوست کی خبر لا، اُس دلربا محبوب کی چھپی ہوئی خوشبو لا۔)

درج بالا دونوں اشعار حضرت امیر خسروؒ کے ہیں۔ شیخ سعدیؒ نے بھی بوستانِ محبوبؐ سے آنے والی نسیم صبح کی کیفیتیں بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ نفسِ دوستاں سے الحانِ بُلبل جاری ہے:

ہر صبح دَم نسیم گُل از بوستانِ تُست
الحانِ بُلبل از نفسِ دوستانِ تُست

اس سلسلے میں چند اُردو شعرا کے اشعار بھی ملاحظہ ہوں:

Scanned with CamScanner

آئی نسیم کوئے محمدؐ صل اللہ علیہ وسلم
کھنچنے لگا دِل سُوئے محمدؐ صل اللہ علیہ وسلم

(بیدم وارثی)

پھر آنے لگیں شہر محبّت کی ہوائیں
پھر پیشِ نظر ہو گئیں جنّت کی فضائیں

(حسرت موہانی)

نسیم طیبہ ادھر بھی جو آنکلتی ہے
دِلوں کو دے کے نویدِ شفا نکلتی ہے

(ابوالامتیازع۔س۔مسلم)

وہ نسیم وصبا جو کوچہ محبوبؐ تک جاتی ہے، وہاں سے گزرتی ہے وہاں سے ہو کر آتی ہے اُس کے حسن ولطافت کی حد نہیں رہتی۔ وہ معطّر اور عنبر فشاں ہو جاتی ہے۔ وہی بادِ صبا تو دراصل "نسیم بہشت" ہے جو کوئے محبوب سے ہو آتی ہے۔ معروف بلوچی شاعر "جام وِرک" نے اپنی ایک نظم میں کوئے محبوب سے ہو کر آنے والی بادِ صبا کو مخاطب کرتے ہوئے اور اُس کا قصیدہ بیان کرتے ہوئے اپنی وارفتگی اور آرزوؤں کو بہت دل نشیں انداز میں پیش کیا ہے۔ کسی دانشور نے جام وِرک کی اِس نظم کا اُردو میں نثری ترجمہ "اے نسیم بہشت" کے عنوان سے کیا ہے جس کی چند سطریں قابلِ توجہ ہیں:

"اے نسیم بہشت"

مرحبا اے نسیم سحر تو بن پوچھے جنّتی ہے
کیونکہ تُو اُس نازک اندام محبوب کی جانب سے آئی ہے
رات تم اُس گُل اندام کے چہرے سے کھیلتی رہی ہے
اُس کے گوہر آسا چہرے کو شبنم سے نم آلود کیا
جب اُس نے چاند کو شرما دینے والا آتشیں چہرہ

Scanned with CamScanner

اوڑھنی سے باہر نکالا ہوا تھا
تُو نے اُس کی زلفوں کی شیریں خوشبو اُڑالی
میری کیا مجال کہ کبھی عرضِ مُدعا کروں
مجھ میں یہ تاب و تواں کہاں
کہ اُس مہ جمال سے گفتگو کر سکوں
میں بیٹھ کر اُس دن کے لیے دعا کرتا ہوں
کہ خدا خود اُس کے دل میں رحم ڈال دے

شیخ سعدیؒ کہتے ہیں کہ جو بادِ صبا محبوب کی خاکِ قدم چوم لیتی ہے اُس کا دامن مشک و عنبر سے بھر جاتا ہے:

صبا گر بگزرد بر خاکِ پایت
عجب گر دامنش مشکیں نباشد

اور امیر خسروؒ کوچۂ محبوب میں فصلِ گُل اور بادِ صبا کی عنبر فشانی کا نقشہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ نگارِ خانۂ جاناں بہشتِ رضواں ہے:

رسید فصلِ گُل و باد عنبر افشانست
نگار خانۂ جاناں بہشتِ رضوانست

عاشقوں کی حیات و زیست اور سانس کی آمد و رفت کا دارومدار ہی نسیم کوئے محبوب پر ہے۔ علامہ اقبالؒ کے آخری ایام کی سوز و مستی اور اُن کی اس پُر تاثیر رباعی سے تمام اہلِ شوق واقف ہیں:

نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سرورِ رفتہ باز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

Scanned with CamScanner

میں ابھی تک عشق و مستی کے کوچے کے ایک مجذوب کو بھولا ہوا تھا، اس کا نام ہے مرزا غالب۔ اس مجذوبِ عشق نے بھی اپنے منفرد انداز میں نسیم وصبا کو اپنے احوال کے بیان میں شامل کیا ہے۔ مرزا غالب نے نسیم وصبا کو قاصد بنانے تک اکتفا نہیں کیا بلکہ اُنھوں نے تو ایک اور صورت ایجاد کی ہے کہتے ہیں کہ میرے بال و پر میں اب طاقت و قوت باقی نہیں رہی کہ خود اُڑ کر کوچۂ محبوب تک پہنچ جاؤں البتہ یہ ممکن ہے کہ افسردگی سے گرد و غبار بن جاؤں اور ہوا اُڑا کر منزلِ مقصود تک پہنچا دے:

مگر غبار ہوئے پر ہوا اُڑا لے جائے
وگرنہ تاب و تواں بال و پر میں خاک نہیں

اگرچہ اس مضمون کی ابتدا مولانا جامیؒ نے یہ کہہ کر رکھ دی تھی:

بر بُر ایں جان مشتاقم درآں جا
فدائے روضۂ خیر البشر کُن

لیکن غالب نے جس بے بسی، عاجزی اور بے مائیگی کی انتہا کر دی ہے اُسی کا حصہ ہے۔

حسن رضا خاں صاحب نے بھی اس مضمون کو یوں بیان کیا ہے:

مٹی نہ ہو برباد پسِ مرگ الٰہی
جب خاک اُڑے میری مدینے کی ہوا ہو

بات غالب کی بلندیٔ فکر اور خیال آفرینی کی ہو رہی تھی۔ درج ذیل شعر میں مرزا غالب نے نسیم وصبا کے مضمون سے جو اعجاز پیدا کیا ہے اہلِ شوق ابد تک سر دھنتے رہیں گے۔ کون ایسا اہلِ درد اور صاحبِ دِل ہو گا جو غالب کا یہ شعر پڑھ کر یا سُن کر تڑپا نہ ہو اور اُس نے اشک نہ بہائے ہوں۔ شعر ملاحظہ ہو:

نسیم مصر کو کیا پیرِ کنعاں کی ہوا خواہی
اُسے یوسفؑ کی بُوئے پیرہن کی آزمائش ہے

Scanned with CamScanner

اِس شعر کی بہت سی تفاہیم اور مطالب ہو سکتے ہیں لیکن میں اس کے اِس پہلو کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ غالب یہ کہنا چاہتا ہے کہ کوچۂ محبوب کی بادِ صبا کی بے نیازی اور بے پروائی قابلِ دید ہے۔ اُسے دامنِ محبوب کی خوشبو میسّر ہے، اُسے ہجر و فراق میں تڑپتے ہوئے عاشقوں کی ہوا خواہی سے کیا غرض ہو سکتی ہے۔

میں نے اپنے اس مضمون میں جو اشعار پیش کیے ہیں وہ صِرف حافظے میں موجود اشعار میں سے منتخب کیے ہیں۔ تحقیق اور تلاش سے ایسے ہزاروں اشعار مل جائیں گے جو اِس موضوع سے مناسبت رکھتے ہیں۔ غرض میں نے نعت کے حوالے سے تحقیق و تنقید کرنے والے طالبانِ شوق کے لیے ایک موضوع چھوڑ دیا ہے۔ اس موضوع پر تحقیقی و تنقیدی کام کی گنجائش موجود ہے۔ نیز اگر کسی قاری کے ذہن میں یہ بات آجائے کہ میں نے اس مضمون میں کچھ غزلیہ اشعار بھی شامل کر دیے ہیں تو اس سلسلے میں یہ عرض ہے کہ نعت کا شعر جہاں بھی ہو وہ نعت ہی ہوتی ہے۔ قصیدہ، غزل اور مثنویوں میں سیکڑوں ایسے اشعار موجود ہیں جو نعت کے سوا کچھ اور نہیں ہیں۔ نعت کا شعر اپنے احساس، جذبے، لہجے، مضمون، بلندیٔ فکر، تقدّس، پاکیزگی، عجز و انکسار اور انتہائے شوق سے پہچانا جاتا ہے۔ خیر یہ بھی ایک الگ موضوع ہے جس پر مدلّل اور سیر حاصل گفتگو کی جا سکتی ہے۔

میں اپنے اس مضمون کا اختتام کسی صاحبِ درد کے ایک قطعے پر کر رہا ہوں جو میں نے اپنے بزرگوں سے سُن رکھا ہے جنھوں نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ آخرِ شب اِس کی تکرار کرنے سے سرکارِ دوعالم اپنے دیدار سے نوازتے ہیں:

نسیما جانبِ بُستاں گُزر کُن
بگو آں نازنیں شمشادِ ما را
ز تشریفِ قدومِ خود زمانے
مُشرّف کُن خراب آبادِ ما را

Scanned with CamScanner

جو ہم پہ گزری اردو کی ایک اہم غیر مطبوعہ خودنوشت

(تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ)

پروفیسر ڈاکٹر مزمل حسین

ڈاکٹر مہر عبدالحق (1915ء-1995ء) بیک وقت ماہرِ لسانیات، ماہرِ فریدیات، شاعر، محقق، مترجم، مفسر، مورخ، ناول نگار اور ماہرِ لغت کے طور پر جانے پہچانے جاتے ہیں۔ 1957ء میں ڈاکٹر سید عبداللہ کی نگرانی میں پی ایچ۔ڈی کا مقالہ بعنوان ''ملتان زبان اور اس کا اردو سے تعلق'' لکھ کر اردو زبان کے مباحث میں ایک نئی بحث کا آغاز کیا کہ اردو زبان نے ملتانی زبان سے جنم لیا ہے اور اس بحث کے لیے عملی تحقیق کر کے اردو کے بہت سے ان ابتدائی الفاظ کی نشاندہی کی ہے جن کا تعلق ملتانی زبان سے ہے۔ یہ وہی الفاظ ہیں جن کا ذکر محمود شیرانی نے پنجابی زبان کی ذیل میں کیا تھا اور بعد میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی تحقیق میں انہی الفاظ کا حوالہ دیا ہے۔ مہر عبدالحق نے اپنی تصنیفی زندگی میں کئی معتبر کتب لکھیں جن میں سے اکثر ان کی زندگی میں ہی شائع ہو گئی تھیں مگر ابھی تک کچھ تصانیف ایسی بھی ہیں جو تشنہءِ طباعت ہیں۔ ان کتب میں ان کی خودنوشت سوانح عمری بہ عنوان ''جو ہم پہ گزری'' بھی ہے۔ اگر اس خودنوشت کو انور طباعت سے آراستہ کر دیا جائے تو اس خودنوشت کا شمار اردو کی بہترین سوانح عمریوں میں ہوگا۔ یہ سوانح عمری تاریخ، تہذیب، ثقافت اور علم و ادب کے پس منظر میں ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سے قبل کہ ہم زیرِ نظر سوانح عمری کا ناقدانہ اور محققانہ مطالعہ پیش کریں، یہ ضروری دکھائی دیتا ہے کہ ہم ''خودنوشت سوانح عمری'' کی ان تعریفوں کا جائزہ لیں جو مختلف ماہرینِ فن نے بیان کی ہیں۔ بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

> ''انگریزی Autobiography کے مترادف کے طور پر آپ بیتی یا خودنوشت سوانح عمری جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے، وہ کتاب جو اپنے ذاتی احوال و کوائف کے بارے میں تحریر کی گئی ہو، اس لحاظ سے پنجابی لفظ 'ہڈ بیتی' بھی بہت مناسب ہے۔''(۱)

ڈاکٹر سلیم اختر اس تعریف کے بعد خودنوشت کی توضیح دلچسپ انداز میں اس طرح سے کرتے ہیں:

> ''اپ بیتی کی تحریر کا نفسی محرک نرگسیت Nurcisism ہے۔ لکھنے والا آپ بیتی کو ایسے آئینے میں تبدیل کر دیتا ہے جس سے وہ دنیا والوں کے سامنے اپنا رویہ پیش کرتا ہے جس سے وہ دوسروں کے مقابلے میں ممتاز و منفرد نظر آتا ہے۔ اس مقصد کے لیے مثبت اور منفی دونوں طرح کا انداز اور اسلوب اپنایا جا سکتا ہے۔ اپنے بارے میں غلو سے

Scanned with CamScanner

بھی کام لیا جاسکتا ہے (مثال: جوش ملیح آبادی کی ''یادوں کی بارات'') اور سادہ بیانی سے بھی (مثال: میرزا ادیب کی ''مٹی کا دیا'') اپنے خراب حالات چھپائے نہیں جاتے (مثال: احسان دانش کی ''جہانِ دانش'') اور اپنی ذات کے حوالہ سے تہذیب وثقافت کی بھی بات کی جاتی ہے (مثال: قراۃ العین حیدر کی ''کارِ جہاں دراز ہے'') اپنا دفاع پیش کیا جاتا ہے (مثال: قدرت اللہ شہاب کی ''شہاب نامہ'') اور خود ہی اپنا محاسبہ کیا جاتا ہے (مثال: ڈاکٹر جاوید اقبال کی ''اپنا گریباں چاک'') الغرض آپ بیتی میں اظہار واسلوب کا بہت تنوع ملتا ہے۔'' (۲)

اسی طرح خودنوشت کے بارے میں چند اور ماہرین کی آرأ دیکھیے۔ بقول مولانا غلام رسول مہر:

''آپ بیتی پر ہمہ گیر بے اعتمادی کا خط بطلان کھینچنا مناسب نہیں۔ دنیا کے عام ذخیرہ نگارش کی طرح آپ بیتی بھی نقد ونظر سے باہر نہیں۔ ہمارے لیے غور وفکر اور چھان بین کے ذریعے سے یہ ہمہ وجود صحیح واقعات اخذ کر لینا مشکل نہیں لیکن نفسِ معلوماتِ صحیحہ کے نقطہ ءِ نظر سے دیکھا جائے تو آپ بیتی کو ہر دور کے ذخیرہ ءِ تاریخی اور انبارِ عبرت پر ترجیح حاصل ہے اور اس کے اعتراف میں تامل کیوں کیا جائے۔'' (۳)

بقول مشفق خواجہ:

''خودنوشت کا اصل مقصد انکشافِ ذات ہے لیکن سماجی قیود اور اخلاقی مفروضات اسے [پردہ ءِ ذات' بنا دیتے ہیں اور اسی لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اپنے آپ کو چھپانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ خودنوشت سوانح عمری لکھ دی جائے۔'' (۴)

الطاف فاطمہ ''خودنوشت'' کے بارے میں یوں اظہارِ خیال کرتی ہیں:

''ایک اچھا 'آپ بیتی' لکھنے والا جانتا ہے کہ جو اعمال اور افعال خود اس سے سرزد ہو چکے ہیں، ان کا تعلق اس کی ذات سے صرف اتنا رہ جاتا ہے کہ وہ اس کے نام اور ذات سے ہی منسوب ہیں اور اب وہ دوسروں کی امانت ہیں کیونکہ دوسروں کو ان سے سبق لینا ہوتا ہے۔'' (۵)

ابوالاعجاز حفیظ صدیقی ''خودنوشت'' آپ بیتی کے حوالے سے ایک منفرد پہلو سے اس طرح رقم طراز ہیں:

''آپ بیتی عام طور پر قابلِ اعتماد سوانح نہیں ہوتی اور مکمل، معیاری اور بے لاگ آپ بیتی لکھنا ممکن بھی نہیں کیونکہ حبِ ذات صداقت کی راہ میں حائل ہوتی ہے۔ آپ بیتی لکھنے والا حبِ ذات سے مجبور ہو کر کہیں اخفا، کہیں مبالغہ اور کہیں ملمع سازی کا مرتکب ہوتا ہے۔ کچھ باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جنھیں انسان اپنے آپ سے بھی چھپاتا ہے۔ دوسروں کو ان رازوں میں کیا شریک کرے گا۔ چنانچہ آپ بیتی میں سب کچھ کہہ دینا ممکن نہیں ہوتا۔ معاشرتی حیوان

Scanned with CamScanner

ہے۔اس لیے وہ اپنی ذات کو بے نقاب کرتے ہوئے تحسین، ملامت اور دوسروں کے ردعمل سے یکسر بے نیاز بھی نہیں ہوسکتا۔دوسروں کے بارے میں سچ بولنا نسبتاً آسان ہے مگر اپنے بارے میں لکھتے ہوئے کھردری صداقت کو ملحوظ رکھنا تقریباً ناممکن ہے۔چنانچہ 'آپ بیتی' لکھنے والا بسا اوقات اپنے عیوب کو چھپاتا ہے یا ان کی تاویل کرتا ہے۔خود مجرم کو اپنا منصف بننے کا موقع دیا جائے تو وہ اپنے جرم کی شدت کو کم کرنے اور اپنے تئیں حق بجانب ٹھہرانے کی کوشش کرتا ہے اور ممکن ہو تو واقعے سے ہی انکار کر دیتا ہے۔''(۶)

ان آرا کی روشنی میں جب ہم ڈاکٹر مہر عبدالحق کی خودنوشت ''جو ہم پہ گزری'' کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ڈاکٹر مہر عبدالحق نے اس صنف کو خوب سمجھا اور اس کی صحیح روح کو مدنظر رکھ کر اپنی سوانح کے احوال قلم بند کیے۔ایک بات توجہ طلب ہے کہ 'خود نوشت' کے حوالے سے لکھنے والے کسی بھی ماہر نے اس پہلو کو نہیں چھیڑا کہ ''خودنوشت'' کیسے لکھنی چاہیے؟ اور کس کی خودنوشت اہم ہوگی؟ یہ بات تو سچ ہے کہ کوئی بھی شخص اپنی سوانح عمری یا آپ بیتی لکھ سکتا ہے مگر راقم کے خیال میں خودنوشت ہمیشہ اسی شخص کی اہم ہوتی ہے جو سماجی، سیاسی یا ادبی اور علمی حوالے سے اہم ہو کیونکہ قاری کے سامنے دلچسپی کا عنصر اسی وقت قائم رہے گا جب خودنوشت نگار، معروف اور اہم ہوگا۔نہیں تو یہ تحریر مصنف کی فیملی کے دائرے تک ہی محدود رہے گی۔اس تناظر میں زیرِ نظر خودنوشت کئی اعتبار سے اہم ہے، مگر المیہ یہ ہے کہ اس تصنیف کو لکھے تین دہائیاں ہونے کو ہیں مگر ابھی تک یہ منصۂ شہود پر نہیں آسکی۔اسلوب اور مواد کے اعتبار سے اس خودنوشت کا معیار اردو کی دیگر مطبوعہ خودنوشتوں سے کسی بھی طور پر کم نہیں ہے۔

اس خودنوشت میں مصنف نے داخلی کیفیتوں، دلی احساس، عملی تجربوں، زندگی کے جذباتی پہلوؤں اور بحیثیت مجموعی زندگی کے بارے میں اپنے نقطۂ نظر کی خوب ترجمانی کی ہے۔کہا جاتا ہے کہ خودنوشت کی تین اہم صورتیں سفرنامہ، رپورتاژ اور روزنامچہ ہوتی ہیں۔ فاضل مصنف نے ان تینوں صورتوں کو بروئے کار لا کر اسے تصنیف کیا ہے اور اسے چودہ ابواب میں ان عنوانات میں منقسم ہے۔

۱۔خاندانی پس منظر۔۲۔ابا جی اور امی جان۔۳۔پانچویں جماعت تک کی تعلیم۔۴۔ہائی سکول کے پہلے تین سال۔۵۔نویں اور دسویں کی تعلیم۔۶۔کالج۔۷۔سوز و ساز کے آٹھ سال۔۸۔سحر ہونے تک (۱۸۴۳ء۔۱۹۴۷ء)۔۹۔سحر گرد گرد۔۱۰۔سرائیکی ثقافت کے مرکز میں۔۱۱۔لسانی تحقیق کی تکمیل تک۔۱۲۔لاہور، ثقافتِ راوی کا مرکز۔۱۳۔نوکری کے آخری دس سال۔۱۴۔علمی، ادبی اور تحقیقی کام کی تفصیل۔

ڈاکٹر مہر عبدالحق زود نویس لکھاری تھے۔زیرِ تحقیق و تدوین کتب (جو کہ تقریباً چار تھیں، مگر وہ انہیں مکمل نہ کر سکے) کے علاوہ انھوں نے ۳۴ کتب تصنیف کیں۔ان کتب میں نصاب کے ساتھ ساتھ کہانیاں، ناول، تحقیق اور تنقید، سوانح عمری، فریدیات، لسانیات، تراجم، تفسیر، قواعدِ زبان، فلسفہ، تعلیم، لغت اور شاعری شامل ہے۔اس پس منظر میں یہ کہنا بجا ہے کہ مہر عبدالحق ایک نابغہ روزگار شخصیت تھے جن کا

Scanned with CamScanner

خمیر مراکز سے بہت دور لیہ جیسے دور افتادہ شہر سے اُٹھا اور انہوں نے اپنی شبانہ روز کاوشوں سے شعر و ادب اور تحقیق و تنقید (اردو و ملتانی زبانیں) کو متاثر کیا۔ اردو زبان کے نام کے بارے میں ایک منفرد رائے دے کر اردو ماہرینِ لسانیات کے لیے نئے سوال پیدا کر دیے۔ ان کا خیال تھا کہ ''اردو'' کا لفظ بنیادی طور پر سرائیکی کا ہے۔ اس حوالے سے وہ اپنے استاد سید محمد شاہ بخاری کی اس رائے سے ہمیشہ متفق رہے:

''نویں اور دسویں میں اردو کی جو درسی کتاب پڑھائی جاتی تھی، اس کا نام ''مرقع ادب'' تھا۔ اس میں محمد حسین آزاد کی کتاب ''آبِ حیات'' کا وہ باب بھی شامل تھا جس میں اردو کے معانی ''لشکر'' کے بتائے گئے ہیں اور ''برج بھاشا'' کے علاقے کو اردو کا مولد ٹھہرایا گیا ہے۔ استادِ محترم قبلہ شاہ صاحب کا موقف اس سے مختلف اور زیادہ صحیح تھا۔ انھوں نے فرمایا: ''اڑدو۔۔۔ ڑ کی آواز کے ساتھ خالص سرائیکی لفظ ہے۔ ترکی زبان میں یہ لفظ ترک سپاہیوں کی معرفت ''سرائیکی'' سے منتقل ہوا۔ ترکی زبان میں ''ڑ'' کی آواز نہیں ہے۔ اس لیے وہاں یہ لفظ ''اردو'' ہو گیا۔ سرائیکی زبان میں یہ لفظ ''انبوہ، کثرت، زیادتی، انبار، ڈھیری'' وغیرہ کے معنوں میں بولا جاتا ہے اور ابھی تک متروک نہیں ہوا۔ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ آج دکانوں پر خربوزوں کے ''اڑ'' لگے ہوئے تھے۔ اس طرح کالی گھٹاؤں کے ہجوم دیکھ کر کہتے ہیں کہ بادلوں کے ''اڑ'' امڈے آ رہے ہیں۔ سودا سلف لینے جائیں تو دکان دار سے کہتے ہیں کہ ذرا ''اڑ'' تولنا۔ ترازو کے جھکاؤ کو ''اڑاند'' کہتے ہیں۔ یہ ت کسی اور زبان میں نہیں ہیں۔ لہٰذا ''اڑدو'' سرائیکی لفظ ہے اور یہی اس کا صحیح تلفظ ہے۔ تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو برصغیر ہندو پاکستان میں مسلمانوں کی آمد اور اس کے نتیجے میں عربی اور فارسی کے اختلاط سے جو نئی زبان وجود میں آئی، اسے وادی سندھ کے مرکز ملتان نے ''اڑدو'' کا نام دیا کیونکہ وادی سندھ ہی وہ سرزمین ہے جس میں یہ لسانی اختلاط پہلی بار ہوا۔''

(۷)

اس بات کا حوالہ انھوں نے اپنی ''خودنوشت'' کے باب پنجم میں بھی دیا ہے۔ اس باب کا عنوان ہے ''نویں اور دسویں کی تعلیم''۔ یہ اس بات کا بھی غماز ہے کہ آپ کو سکول کی زندگی ہی سے ایسے اساتذہ مل گئے تھے جنھوں نے آپ کے ادبی ذوق کو ایک نکھار بخشا اور آپ کو آغاز سے ہی بالخصوص سرائیکی زبان و ادب سے وابستہ کر دیا۔ آپ کی خودنوشت کے پہلے باب سے لے کر آخر تک یہ وابستگی بآسانی محسوس کی جا سکتی ہے۔ اس خودنوشت کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں جہاں مہر صاحب نے اپنے خاندان اور اپنے احوال پیش کیے ہیں وہاں پس منظر کے طور پر تاریخ سے بھی مکمل استفادہ کرتے ہوئے مستند حوالے دیے ہیں۔ پہلے باب بعنوان ''خاندانی پس منظر'' میں سرا خاندان کی وضاحت کرتے ہوئے ''سمیرین'' تہذیب پر اس طرح روشنی ڈالی ہے، وہ لکھتے ہیں:

Scanned with CamScanner

''راقم الحروف کی کتاب The Soomras میں یہ حقیقت پوری وضاحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے کہ قبائل کی نقل و حرکت کے اس قدیم زمانے میں میسوپوٹیمیا جنوبی ایران اور موجودہ سندھ اور بلوچستان؛ اس طرح الگ الگ علاقے نہیں تھے۔ جس طرح آج کی ملکی تقسیمیں انہیں ظاہر کرتی ہیں۔ نہ ان کے درمیان کوئی سرحدیں تھیں اور نہ لوگوں کی آمد و رفت پر کوئی پابندیاں عائد تھیں۔ وسطِ ایشیا سے نکل کر ادھر ادھر گھومنے پھرنے والے قبائل میں سے بعض نے کہیں کہیں مستقل آبادیاں قائم کر لی تھیں اور بعض ابھی مستقر کی تلاش میں تھے۔ تاہم یہ سب ایک ہی اصل اور نسل کے شعوب تھے۔ غیر سامی النسل ہونے کی وجہ سے ''سمیر'' کہلاتے تھے۔ سندھ، عراق، بلوچستان اور جنوبی ایران کی تہذیب کو مورخین نے ''سمیرین تہذیب'' کا نام دیا ہے۔ اس تہذیب کے بانی مبانی ''سمرا'' تھے جو آج سندھ میں سومرو، عراق میں سمرا، وسطی وادی میں سمر، سمراہ وغیرہ کے نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں اور زندہ و پائندہ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔''(۸)

''دی سومروز'' کو شائع ہوئے چھبیس برس گزر گئے ہیں مگر آج تک مہر صاحب کی اس بات کی تردید نہیں کی گئی کہ سمرا خاندان کا تعلق ''سمیرین تہذیب'' سے تھا۔ اس باب میں انہوں نے آریاؤں کے مقابلے میں سمراؤں کو مہذب اور تمدنی زندگی کے علمبردار کہا ہے جبکہ عام خیال یہ ہے کہ آریا مہذب اور متمدن تھے اور یہاں کے مقامی باشندوں کے مقابلے میں زیادہ بہتر تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

''وادی سندھ میں سمراؤں کی آمد اور شمالی پہاڑی علاقوں میں کوہ ہندوکش کے قریب آریاؤں کی آمد کے درمیان ایک ہزار سال کا وقفہ ہے۔ سمرا شہری تہذیب کو عروج تک لے جا چکے تھے لیکن آریہ ابھی تک نیم مہذب تھے۔ تہذیبی مراکز کو تہس نہس کر دینا ان کا بڑا کارنامہ تھا۔ سائکھیا کے حوالے سے سائیتھ کا لفظ عراق عرب وغیرہ میں پہنچا تو یہ اسے ساکا بنا دیا۔ چونکہ سمرا کاشتکاری کے بھی ماہر تھے، اس لیے ''جٹ'' کہلائے۔ ان کی ایک شاخ ''مور'' جہاز ران تھی جو آبی شاہراہوں کے ذریعے تجارت کرتی تھی۔''(۹)

اس بات میں ڈاکٹر مہر عبدالحق نے بعض مستند کتب کے حوالے دے کر ''سمراؤں'' کے خاندانی پس منظر کو اجاگر کیا ہے۔ ان کتب میں ''راج ترنجنی'' اور ''وقائع راجستھان'' شامل ہیں۔ وہ ان کتب کی مدد سے لفظ ''سمرا'' کو واضح کرتے ہیں۔ وقائع راجستھان کے مطابق ''سمرا'' یہ ہیں:

''وقائع راجستھان میں ایک جگہ اومرا، سومرا کا ذکر کیا گیا ہے۔ اومرا کے صحیح معنی معلوم نہیں ہو سکے۔ سرائیکی اور سندھی زبانوں میں ''تھر'' کے رہنے والے کو تھوری کہتے ہیں۔ ''سُر'' لگانے والے کو سوری کہا جاتا ہے۔ دھبے دور کرنے والا دھوبی ہے۔ اسی اصول کے تحت امری کا باشندہ ''اومری'' کہلائے گا۔ سمراؤں نے اسی امری کے مقام

پر جو سندھ اور بلوچستان کی سرحد پر واقع ہے، کاشتکاری کو فروغ دیا تھا۔ جب یہاں سے نقل مکانی کر کے دوسری جگہ پہنچے تو امری کے حوالے سے انہیں ''اومری سمرا'' اور پھر ''اومرا سمرا'' کہا گیا۔ تورات میں ایک بادشاہ کا نام ''اومری'' بتایا گیا ہے۔''(۱۰)

اسی کتاب کے حوالے سے انہوں نے ''سمرا'' لفظ کی عجیب وغریب توجیح پیش کی ہے۔ وقائع راجستھان سے ان کا دیا ہوا ایک اقتباس دیکھیے:

''اسرائیل کے لوگ آپس میں بٹے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ گیاتھ کے بیٹے، تبنی کو بادشاہ بنانا چاہتے تھے اور کچھ اومری کے حق میں تھے۔ آخر کار اومری کے طرف دار جیت گئے۔ تبنی مر گیا اور اومری بادشاہ بن گیا۔ اومری یہودا کے بادشاہ آسا کی حکومت کے اکتیسویں سال بادشاہ بنا اور اس نے بارہ سال حکومت کی۔ پہلے چھ سال اس نے تیرزا میں حکومت کی۔ پھر اس نے ''شیمر'' نامی ایک شخص سے ''سمیریا پہاڑی'' چھ ہزار نقرئی ٹکڑے دے کر خریدی۔ اومری نے قلعے تعمیر کر کے اس پہاڑی کو محفوظ مقام بنا ڈالا اور پہاڑی کے سابق مالک ''شیمر'' کے نام پر ایک شہر ''سمیریا'' آباد کیا۔''(۱۱)

اسی باب میں انہوں نے اپنے دادا کے حوالے سے پوری بے باکی سے لکھ کر لیہ کے سمراؤں کے سماجی مزاج پر بھی روشنی ڈال دی ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

''دادا جانے کے صرف اتنے ہی حالات مجھ تک پہنچے ہیں جتنے میں یہاں بیان کر رہا ہوں۔ یہ اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے اور جانشینی کے اصولوں کے مطابق خاندان میں سب سے بڑے تھے۔ سندھی زبان میں ایسے سینئر موسٹ سربراہِ خاندان کو وڈیرا یا پگاڑا (پگ دار) کہتے ہیں۔ ملکیت میں بھی سب سے زیادہ تھے۔ جتنی اراضیات ان اکیلے کی تھیں اتنی باقی سارے خاندان کی تھیں۔ مثل مشہور ہے کہ جب بیرونی دشمن آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے تو انسان اپنے اندر سے اپنا دشمن ڈھونڈ نکالتا ہے۔ یہی کچھ دادا جان کے ساتھ ہوا۔ اپنوں میں سے کوئی حاسد اٹھا۔ دادا جان سے دوستی گانٹھی۔ انہیں چرس اور گانجے کا عادی بنا دیا اور پھر زمینیں ہتھیانی شروع کر دیں۔ کثیر ملکیتوں کا نشہ پہلے ہی چڑھا ہوا تھا۔ چرس گانجے کے نشے نے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتوں کو ماؤف کر دیا۔ جھوٹی انا فیاضی کا روپ دھار کر تسکین کی راہیں نکال رہی تھی۔ دادا جان نے اپنی سب ملکیتیں انہی نشوں کی بھینٹ چڑھا دیں۔ گھر پھونک تماشا دیکھنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دادا جان کے ہاں شادی کے تقریباً پندرہ سال بعد تک بیٹیاں ہی پیدا ہوتی رہیں۔ قصیدہ خواں خوشامدیوں کے ہاتھ یہ دلیل آ گئی کہ اتنی بڑی جائیداد اور لوگ لے جائیں

Scanned with CamScanner

گے۔کوئی وارث نرینہ اولاد تو ہے نہیں، لہٰذا کیوں نہ خود کھاؤ اور مزے اُڑاؤ۔ چنانچہ عشرتِ امروز کے فریب میں آ کر فکرِ فردا کو بھول گئے اور ایسی غفلت برتی کہ جب 1882ء کے لگ بھگ ابا جی کی ولادت ہوئی تو تمام ملکیتیں بک چکی تھیں۔''(۱۲)

یہی وہ مزاج ہے جس نے تھل کے اس بڑے زمیندار گھرانے کو اس کی جاگیروں سے محروم کر دیا اور یہ دیہات کی تہذیب سے الگ ہو کر شہری تہذیب کا خاندان بن کر رہ گیا اور مختلف محلوں میں منقسم ہو گیا اور اپنے نام سے محلوں کو آباد کر عظمت رفتہ کو قائم رکھنے کی کوشش کیں۔اس باب میں مہر عبدالحق نے پس منظری تناظر سے بعض تاریخی حقائق کو بھی اجاگر کیا ہے۔

دوسرے باب کا عنوان ''ابا جی اور اماں جان'' ہے۔جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے کہ اس باب میں انھوں نے اپنے والدین کی شخصیت اور سماجی اور خاندانی رویوں کی نشاندہی کی ہے مگر اسی باب میں اس وقت کی انگریز حکومت کے بعض انتظامی معاملات کو بھی بیان کر دیا ہے۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان کی والدہ کا تعلق ''اعوان'' قوم سے تھا۔اس طرح یہ حقیقت بھی سامنے آئی ہے کہ مہر صاحب نجیب الطرفین ''سمرا'' نہیں تھے۔اس باب سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ مہر صاحب کا تعلق سمرا خاندان کی جس شاخ سے تھا وہاں تعلیم کی روایت موجود تھی۔

''پانچویں جماعت کی تعلیم'' اس خودنوشت کا تیسرا باب ہے۔اس کے آغاز میں ''آپ بیتی'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جس کسی نے یہ کہا ہے کہ 'خطائے بزرگان گرفتن خطاست'، اس نے یقیناً کبھی آپ بیتی نہیں لکھی۔اپنے اور آباء و اجداد کی زندگی کے حالات سے پردہ اٹھانا بڑا مشکل اور دکھ دینے والا کام ہے۔احتیاط صرف اتنی برتی جا سکتی ہے کہ ان کی خطاؤں کو انہی کے ماحول میں دیکھا جائے اور انہیں خطا کی بجائے مجبوری یا تقاضائے وقت سمجھا جائے۔''(۱۳)

مہر صاحب کے اس بیان سے آپ بیتی کے مفہوم کا پتا چلتا ہے کہ خطا کرنا فطرتِ انسانی ہے۔اس لیے خطا کو مدنظر رکھ کر کسی کے بارے میں منفی رائے قائم نہیں کرنی چاہیے لیکن آپ بیتی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ حقائق کو پردہء اخفا میں نہیں رکھنا چاہیے۔زیرِ نظر آپ بیتی میں اسی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے فاضل مصنف نے پوری ایمانداری کے ساتھ اپنے اور اپنے خاندان کے بارے میں اظہارِ خیال کیا ہے اور معلومات کو قارئین تک پہنچایا ہے۔اس بات میں مصنف نے اپنی ابتدائی تعلیم اور اپنے علاقے میں تعلیمی ماحول کو بے لاگ انداز میں پیش کیا ہے۔ پانچویں جماعت کا امتحان پاس کرنے کے بعد آپ کو اندر بھان بھراتری ہائی سکول لیہ میں داخل کرا دیا گیا جس کے ہیڈ ماسٹر کا نام لالہ آسام رام تھا۔اسی باب میں انھوں نے اپنے اس ہم جماعت کا ذکر بھی کیا ہے جو سائنسی شعور رکھتا تھا اور اس نے انھی دنوں کئی حیرت انگیز کارنامے سرانجام دیے۔اس کے علاوہ مہر صاحب نے اپنا ایک ذاتی تجربہ بھی بیان کیا ہے کہ چھپکلی کی دم کٹنے

Scanned with CamScanner

سے دم میں جو کافی دیر تک تڑپ باقی رہتی ہے، اس کی وجہ چھپکلی کی دم اور اس کے جسم کا آپس میں وہ تعلق ہے جس کی بنیاد باہمی وابستگی ہے۔ اسے وہ Love current کا نام دیتے ہیں کہ یہ اجزا کو ایک دوسرے کے ساتھ اور اپنے کل کے ساتھ پیوستہ رکھتی ہے۔ اسی باب میں وہ اپنے سکول کے ایام کے تناظر میں ہندوانہ تعصب کی بھی کئی تصویریں قاری کے سامنے لاتے ہیں اور باب کے آخر میں لیہ کے معروف صوفی حضرت مولوی غلام حسین سہواگؒ کے حوالے سے اس واقعہ کا چشم دید منظر بھی بیان کرتے ہیں جس میں یہ روایت ہے کہ وہ جن غیر مسلموں کی طرف شہادت انگلی اٹھاتے تھے، وہ کلمہ طیبہ پڑھ کر دائرہ ءِ اسلام میں داخل ہو جاتے تھے۔ یہ واقعہ ایک سکھ آفیسر کی بیوی سے متعلق ہے۔

اگلا باب ان کی نویں اور دسویں کی تعلیم سے متعلق ہے۔ اس لیے اس کا عنوان بھی یہی رکھا گیا ہے۔ اس بات میں انھوں نے اپنی تعلیمی کارکردگی اور اپنی دلچسپی کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ سکول اور سکول کے باہر کے حالات پر عالمانہ نگاہ دوڑائی ہے اور تعلیم کے بارے میں کچھ بات کی ہے۔ 1929ء میں آپ دسویں جماعت میں پروموٹ ہو گئے۔ اسی برس لیہ اور گرد و نواح میں آنے والے سیلاب نے جو تباہ کاریاں کیں، ان کے بارے میں بھی لکھا ہے:

> ''اس سال دریائے سندھ کے غیظ و غضب نے معمول کے تمام انتظامات کو ملیا میٹ کر کے رکھ دیا۔ بڑے بوڑھے کہنے لگے کہ ہم نے بلکہ ہمارے باپ دادا نے بھی اس شدت کا سیلِ بلاخیز پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ گزیٹیئر مرتب کرنے والے محققین کے مطابق اگر ہم کالا باغ سے جنوب کی طرف دریائی سفر پر روانہ ہوں تو ہم دیکھیں گے کہ دریائے سندھ کا مشرقی کنارا ایک میل پر ایک فٹ کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ کوٹ سلطان کے مقام پر جو لیہ سے ۱۴ میل جنوب میں واقع ہے، کنارے کی بلندی اور پانی کی سطح برابر ہو جاتے ہیں۔ اس حساب سے ۱۴ فٹ نہیں تو کم از کم دو قد آدم کے برابر گہرا پانی ہر طرف ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ یہ تباہ کن سیلاب اتنا اچانک آیا تھا کہ کسی کو مال اسباب تو ایک طرف اپنی اور اپنے بال بچوں کی جان بچانے کی مہلت بھی نہیں ملی تھی۔ کچے پکے مکانات گر گئے۔ درخت جڑوں سے اکھڑ گئے۔ مال مویشی بہہ گئے۔ کھانے پینے کو کچھ نہ رہا۔ نہ کہیں آگ نہ دھواں نہ روشنی، ہر طرف پانی ہی پانی، تاحدِ نگاہ پانی اور پانی پر تیرتی ہوئی انسانی نعشیں، کریہہ المنظر آبی جانور، اژدہا اور سانپ۔ کچھ لوگ صرف اس وجہ سے زندہ بچ گئے کہ انہیں کہیں کہیں بڑے بڑے تناور درختوں پر چڑھ جانے کا موقع مل گیا تھا۔ گو کہ دھڑکا یہی لگا ہوا تھا کہ درخت اب گرا کہ اب گرا۔'' (۱۴)

اس باب میں مہر صاحب نے اپنے سکول کے ایام کے حالات و واقعات تفصیل سے بیان کیے ہیں اور اپنی میٹرک کی تعلیم کی تکمیل کی بات کی ہے۔ اگلا باب ''کالج'' کے عنوان سے ہے۔ 1930ء میں آپ ایس ای کالج بہاولپور میں داخل ہوئے۔ اس وقت سرائیکی

Scanned with CamScanner

وسیب میں بہاولپور، ملتان اور ڈیرہ اسماعیل خان کے علاوہ کہیں کالج نہیں تھا۔ کالج کے دوران حالات وواقعات، ریاست بہاولپور کے والیان کے احوال، بہاولپور کے علمی، تعلیمی، تہذیبی اور ثقافتی ماحول بھی اس باب کا بڑا حوالہ ہے۔ مہر صاحب نے یہیں سے گریجویشن کی اور ان کی تعلیم کے دوران میں احمد ندیم قاسمی بھی یہیں طالب علم رہے جن کے ساتھ ان کی ملاقاتیں رہیں۔ 30 جون 1935ء کو آپ نے بی اے کا امتحان اعلیٰ سیکنڈ ڈویژن میں پاس کرلیا۔ یہ وہی سال ہے جب کوئٹہ میں خوف ناک زلزلہ آیا تھا جس کی وجہ سے تقریباً آدھا شہر لقمہءِ اجل بن گیا تھا۔ یہ تفصیل بھی اس باب کا حصہ ہے:

سوز وساز کے آٹھ سال (1935ء۔1943ء) زیرِ نظر سوانح عمری کا طویل باب ہے۔ اس باب میں مہر صاحب نے اپنی مزید تعلیم، ملازمت اور اپنی پہلی شادی (جولائی 1938ء) کے احوال کے ساتھ ساتھ ملک کے سیاسی حالات بھی بیان کیے ہیں۔ اس باب سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں تعلیم اور ملازمت کا حصول کتنا مشکل تھا اور یہیں سے انہیں ملتانی زبان کی تحقیق کے حوالے سے اپنا ذہن بنانے کا ذوق پیدا ہوا۔ آٹھواں باب بعنوان ''سحر ہونے تک'' (1943ء تا 1947ء) ہے۔ اس باب میں انہوں نے اپنی ملازمت اور خاندانی مسائل کو پیش کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ انہیں گورنمنٹ کی مستقل ملازمت ملنے میں تقریباً ڈیڑھ سال لگ گئے تھے۔ اس دوران میں انھیں پپلاں ضلع میانوالی، چیچہ وطنی ضلع ساہیوال، خان گڑھ ضلع مظفرگڑھ میں دو دو، تین تین مہینے کی عارضی نوکریاں ملتی رہیں۔ اسی اثنا میں وہ ملتانی زبان کے حوالے سے عملی تحقیق بھی کرتے رہے۔ لکھتے ہیں:

> ''سرائیکی زبان کے ذخیرہءِ الفاظ اور اس کے پختہ اصول وقواعد کا اندازہ ڈی سی آفس کی لائبریری سے ہوا تھا۔ اب قدرت نے مختلف لب ولہجے والے علاقے پھرا کر اس زبان کے محاسن کا براہِ راست مشاہدہ کرادیا۔'' (۱۵)

اس میں علامہ اقبال اور حضرت خواجہ غلام فریدؒ اور قیامِ پاکستان کے بارے میں بھی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ خواجہ غلام فریدؒ کے کلام کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''خواجہ صاحب کی وفات 1901ء میں ہوئی۔ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ 1944ء تک نہ خواجہ کے کلام کا ترجمہ ہوا اور نہ اسے عام کیا گیا۔ علامہ طالوت نے مبسوط مقدمہ لکھ کر دیوانِ فریدی کا بھرپور تعارف کرایا۔ میری خوش قسمتی کہ ان کے توسط سے مجھے بھی اس عظیم شاعر کے آفاقی پیغام کو سمجھنے کا موقع ملا۔'' (۱۶)

نواں باب ''سحر گرد گرد'' (1948ء۔1949ء) کے عنوان سے ہے۔ عنوان کی مناسبت سے مہر صاحب نے اپنے کچھ تلخ واقعات کو اجاگر کیا ہے۔ ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ محکمہ تعلیم خصوصاً سکول ڈیپارٹمنٹ ابتدا ہی سے مسائل کا شکار تھا اور اس محکمے کے اربابِ اختیار بے حسی کا شکار تھے۔

دسویں باب کا عنوان ''سرائیکی ثقافت کے مرکز میں'' (1950ء) ہے۔ یہ باب سرائیکی زبان اور ثقافت کے پس منظر میں نہایت

Scanned with CamScanner

اہم ہے۔ مہر صاحب نے بعض تاریخی، تمدنی اور جغرافیائی حوالوں سے جام پور کو سرائیکی ثقافت کا مرکز قرار دیا ہے۔ چند اقتباسات دیکھیے:

''جام پور کے علاقے کی سرائیکی نرم لہجے کی زبان ہے جو جیکب آباد تک بولی جاتی ہے۔ لوگ طویل جملے نہیں بولتے بلکہ چھوٹے چھوٹے فقروں میں بات کرتے ہیں۔ حال احوال پوچھنے اور بتانے کا عجیب اور منفرد رواج ہے۔ حال نہ پوچھنا سخت معیوب سمجھا جاتا ہے۔ ہر ملاقات پر حال پوچھا اور سنایا جاتا ہے۔ ہم عمر اور ہم رتبہ شخص سے میزبان رسمی دعا سلام کے بعد کہے گا: ''ادا حال ڈے۔'' (بھائی جان اپنا حال احوال سنائیں)۔ عمر یا رتبے میں بڑے آدمی کو ادا کی بجائے ''سائیں'' کہیں گے۔ نو وارد اگر اکیلا ہے تو حال شروع کر دے گا اور اس کے ساتھ اور لوگ بھی ہیں تو وہ ہر ایک کو باری باری دعوت دے گا کہ تم حال سناؤ، آخر میں وہ خود گروپ لیڈر کی حیثیت سے حال سنانا شروع کر دے گا اور پوری تفصیل بیان کرنے کے بعد اپنی آمد کا مقصد ظاہر کرے گا۔'' (۱۷)

ان معاشرتی باتوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے جام پور کی جغرافیائی حالت اور یہاں کی علمی اور ادبی شخصیات پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔ ساتھ ساتھ تونسہ شریف کے لوگوں اور حضرت شاہ سلیمان تونسویؒ کے احوال بھی بیان کیے ہیں۔ تونسہ کے لوگوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''تونسہ کے لوگ خوش وضع، ہمدرد، محنتی اور جفاکشی کے عادی ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ دنیا کا کوئی معروف اور غیر معروف خطہ ایسا نہیں ہے جہاں تونسہ کا کوئی شخص نہ پہنچا ہو۔ شرح تعلیم یا فنگی خاصی بلند ہے۔ ایک خصوصیت یہ ہے کہ تونسہ کا رہنے والا کہیں بھی ہو، اپنی زبان، سماجی روایات، معاشرتی اقدار اور ثقافت کو نہیں بھولتا۔ داستان گوئی کا قدیم ثقافتی رواج اس علاقے میں ابھی تک جاری ہے۔ میں نے ریتڑہ کے ہیڈ ماسٹر محمد یار صاحب کو اپنے ساتھ رکھا اور سرکاری فرائض ادا کرنے کے بعد فارغ وقت میں داستان گو حضرات اور مقامی شعرا کے ساتھ نشستیں کرتا رہا۔ اس علاقے میں سرائیکی لوک ادب متنوع صورتوں میں زبان زدِ خلائق ہے۔'' (۱۸)

یاد رہے کہ مہر صاحب کو جام پور میں ملازمت کے دوران ہی میں کچھ عرصے کے لیے تحصیل تونسہ شریف میں بطور ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز، عارضی طور پر رہنا پڑا تھا۔ اس طرح کی یادداشتیں اسی عرصہ کی ہیں۔ اسی باب میں انھوں نے چراغ اعوان کی ہیر کا ذکر بھی کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''یہ قصہ آج سے تقریباً تین سو سال پہلے یعنی ۱۱۲۱ھ کا لکھا ہوا تھا اور اس کے کسی قلمی نسخے کے دستیاب ہونے کی کوئی امید نہیں تھی۔ اس لیے میں نے کیفی صاحب سے کہا کہ ان دونوں نسخوں (یہ دونوں نسخے مہر صاحب کو چودھری محمد صدیق کی دکان سے کتابچوں کی صورت میں ملے تھے، دونوں ہی ''ہیر'' از چراغ اعوان کے قصے کے تھے) کا

Scanned with CamScanner

تقابلی مطالعہ کر کے ایک تیسرا صحیح نسخہ مرتب کریں۔ چنانچہ انہوں نے بڑی خوشی سے میری یہ گزارش منظور کر لی اور بڑی محنت اور عرق ریزی کے بعد ایک صحیح نسخہ مرتب کر دیا۔ تیس سال کے بعد میں نے ڈاکٹر طاہر تونسوی صاحب سے ایڈیٹ کرا کر سرائیکی ادبی بورڈ ملتان کی طرف سے اسے شائع کرا دیا۔'' (۱۹)

مہر صاحب کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرائیکی زبان وادب کی تحقیق اور وقوع پذیر ہونے والی ان کی لسانی اور علمی خدمات کو ''جام پور'' نے بنیادیں بخشیں، وہ خود اعتراف کرتے ہیں:

''ان دنوں سرائیکی زبان مختلف علاقوں میں مختلف ناموں سے پکاری جاتی تھی۔ لوگ اس کا قدیمی نام سروکی یا سرائیکی بھول چکے تھے جس کے معنی ہیں 'سر' کی زبان، اوپر کے علاقے کی زبان یا دریائے سندھ کے بالائی میدانی علاقے کی زبان۔ وادی سندھ ٹکڑوں میں بٹ گئی تو اس کی زبان کا بھی مختلف ٹکڑوں کے ناموں سے منسوب ہونا قدرتی امر تھا۔ چنانچہ یہ کبھی اُچی کہلائی، کبھی ریاستی یا بہاولپوری یا احمد پوری کے نام سے پکاری گئی، مظفر گڑھ میں اسے مظفر گڑھی، ڈیرہ غازی خان میں دیرہ وال، بلوچوں کے جنوبی علاقوں میں جگدالی یا یغدالی، دیرہ اسماعیل خان میں ہندکو اور ملتان میں ملتانی کا نام دیا گیا۔ تاہم لوگ اپنے اپنے علاقے کو اہمیت دینے کی غرض سے اس زبان کو علاقائی نام دینے لگ گئے تھے۔ میری اس بیس سالہ خاک گردانی نے بالکل واضح طور پر ثابت کر دیا تھا کہ جہاں جہاں میں گھومتا پھرتا رہا ہوں وہاں کی زبان وثقافت ایک ہی ہے۔ اصول وقواعد کے اعتبار سے نہایت پختہ زبان ہے اور ذخیرہ ءِ الفاظ کی وسعت میں اس زبان کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ پھر تاریخی نقطہ ءِ نظر سے جائزہ لیا تو واضح ہو گیا کہ عربی اور فارسی اور دوسری زبانوں نے جو سندھ کے فاتحین کی معرفت یہاں پہنچی تھیں، جس مقامی زبان کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے، وہ یہی زبان ہے۔ اس آخری بات کے حوالے سے اردو زبان کہلانے کی مستحق بھی یہی زبان ہے جسے اب ''ملتانی'' کہا جاتا ہے۔ یہی بات 1930ء میں میرے استادِ محترم سید محمد شاہ صاحب نے مجھے بتائی تھی اور اسی بات کے شواہد میرے طویل مطالعے نے مہیا کیے تھے۔ چنانچہ اپنے مطالعہ اور مشاہدات کے مختصر نکات میں نے اورنٹیل کالج لاہور کے پرنسپل ڈاکٹر سید محمد عبداللہ صاحب کو لکھ بھیجے اور گزارش کی کہ میں ''ملتانی زبان اردو کی ماں ہے'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ۔ ڈی کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے یونیورسٹی کی طرف سے اجازت دی جائے۔ سید صاحب بہت خوش ہوئے۔ مقالے کا عنوان بدل دیا اور فرمایا کہ اسے ''ملتانی زبان اور اس کا اردو سے تعلق'' بنا دو۔ مقالے کا خلاصہ مختلف ابواب میں تقسیم کر کے بھیجو اور درخواست کے ساتھ ان کتابوں کی فہرست بھی ارسال کرو جو تمہارے مطالعے میں آئیں گی۔ میں نے حکم کی تعمیل کی۔ ایک مہینے کے بعد یونیورسٹی سے

Scanned with CamScanner

منظوری آ گئی۔ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ صاحب خود میرے مقالے کے نگران بن گئے اور میں نے ''جام پور'' میں ہی اتنا بڑا تحقیقی کام شروع کر دیا۔''(۲۰)

وقت نے ثابت کر دیا کہ اسی تحقیقی کام کی بنیاد پر آگے چل کر مہر صاحب نے سرائیکی زبان کی مزید تحقیقیں کیں، فریدیات میں بنیادی نوعیت کا کام کیا اور کلامِ فرید کی فرہنگ ترتیب دی۔ اسی طرح سرائیکی زبان میں تراجم سے سرائیکی زبان کو وسعت عطا کی۔ تھل کی تہذیب، ثقافت، لوک ادب اور ریت روایت کو نئے انداز میں پیش کیا۔ تھل کے ایک اہم قبیلے ''سمرا'' کو تاریخی اور عمرانی تناظر میں دیکھا اور تحقیق کی نئی راہیں تلاش کیں۔

اس بات کے بعد ''لسانی تحقیق کی تکمیل تک'' (1951ء۔ 1957ء) کے عنوان سے لکھا گیا باب ہے۔ اس میں انھوں نے اپنی پی ایچ۔ ڈی، سرائیکی لوک ادب اور دیگر کتب کا حوالہ دیا ہے اور تحقیق کے مختلف مراحل کی تفصیل بتائی ہے۔ اسی باب میں ایک کمشنر صاحب سے متعلق واقعہ لکھ کر قارئین کو متحیر کر دیا ہے کہ کس طرح اس وقت کے افسر علم و ادب کے دلدادہ تھے۔ اگر مہر صاحب آج زندہ ہوتے اور ضلعی اور ڈویژنل انتظامیہ کے خوشامدانہ رویے دیکھتے جو وہ ممبران اسمبلی اور اہلِ سیاست کے ساتھ روا رکھتے ہیں اور اہلِ دانش و بینش کی جو بے قدری کرتے ہیں تو غم سے مر جاتے۔ ہم کس عصرِ بے چہرہ کے افراد ہیں کہ آج وہ لوگ معتبر ٹھہرے ہیں جو زمین پر بوجھ ہیں اور جنہیں زندگی کا شعور ہے وہ شرم سے منہ چھپاتے پھرتے ہیں۔

''ثقافتِ راوی کا مرکز'' بارہواں باب ہے۔ اس کا آغاز اہلِ لاہور سے ناراضی اور ناپسندیدگی سے کیا گیا ہے اور مختلف ضرب الامثال سے انھوں نے اپنے موقف کو مستند کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح اہلِ لاہور کے سماجی رویے اور وہاں کی بے راہ روی کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ مہر صاحب کی بہت سی باتوں سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے، جس کلچر کی وہ بات کر رہے ہیں، وہ تو تمام میٹروپولیٹن شہروں کا ہوتا ہے۔ کیا آج کے کراچی، ممبئی یا اسلام آباد میں یہ کلچر موجود نہیں ہے؟

اسی باب میں پنجابی افسروں کے تعصب کی بات بھی ہوئی ہے بلکہ اس پوری خودنوشت میں کئی جگہوں پر اس تعصب کا حوالہ موجود ہے کہ مہر صاحب کو اتنا مطالعہ کرنے اور اہم ترین موضوع پر پی ایچ۔ ڈی کرنے کے باوجود پسندیدہ جاب نہ مل سکی اور ان کے مقابلے میں ان کی صلاحیت سے کہیں کم تر لوگ بڑے بڑے عہدوں پر پہنچ گئے۔ وہ ایک آفیسر کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''تمہاری پی ایچ۔ ڈی کسی اور مضمون میں ہوتی، ''ملتان زبان'' پر نہ ہوتی تو ہم علیحدہ کیس بنا کر تمہاری ترقی کے لیے کمیشن سے بطورِ خاص منظوری لے لیتے۔ اب بھی اگر تم اپنے موقف سے ہٹ جاؤ، ملتانی زبان کو پنجابی کا انگ یا لہجہ یا شاخ تسلیم کر لو اور اپنی سرگرمیوں سے باز آ جاؤ تو بہت کچھ ممکن ہے۔ میرا جواب صرف یہ ہوتا کہ یارو! مجھے معاف رکھو میں نشے میں ہوں، اور، یہ وہ نشہ نہیں ہے جسے ترشی اُتار دے، بلکہ اب تو اتنی ترشیاں اور تلخیاں حلق سے

Scanned with CamScanner

نیچے اُتار چکا ہوں کہ ذائقے کو دوسرے مزے ہی بھول گئے ہیں۔'' (۲۱)

مہر صاحب نے اس طرح کے امتیازات کا قدم قدم پر مشاہدہ پیش کیا ہے۔ شاید انہی مشاہدات اور تجربات کا منطقی نتیجہ تھا کہ آپ ایک سرائیکی قوم کے سرپرست کے طور پر سامنے آئے اور اپنی قوم کی شناخت کی اساسی قدر ''زبان'' پر اپنی پوری توجہ مرکوز کی اور بابائے سرائیکی کہلائے۔ وہ اس بیانیہ کو بھی سمجھ گئے تھے کہ بدیسی لوگوں کی لائی ہوئی تہذیب جو کہ مہاجرین کی وساطت سے اس دھرتی کا مقدر بنی تھی، اس نے یہاں کی تمام سماجی، تہذیبی اور اخلاقی قدروں کو تہس نہس کر دیا اور آج پورا ملک شناختی بحران کا شکار ہو گیا ہے۔ وہ اسی باب میں طویل بحث کے بعد اپنا یہ تھیسز بیان کرتے ہیں:

''آج 1992ء میں جبکہ یہ سطور لکھ رہا ہوں، پاکستانی معاشرہ جس بحران میں مبتلا ہے، اس کی ذمہ داری صرف اور صرف اس وقت کے ایجوکیشنسٹس پر عائد ہوتی ہے جو قول اور عمل کے تضادات کا شکار ہو گئے، ذاتی مفادات کے سیلاب کے سامنے نہ ٹھہر سکے اور ان مقاصد کو بھول گئے جن کی خاطر پاکستان وجود میں آیا تھا۔ میری حیثیت ایک معمولی ٹیچر کی تھی، بس ذرا پرانا ٹیچر تھا، ذہانت، قابلیت، دیانتداری، اعلیٰ صلاحیت، علمی استعداد بلکہ سیرت و کردار کے جانچنے کا معیار گریڈ اور عہدہ تھا۔ چھوٹے آدمی کو کوئی حق حاصل نہ تھا کہ وہ کوئی بڑی بات کرے یا بالا تر لوگوں پر تنقید کرے۔ اگر کسی چھوٹے ملازم سے کوئی کام کی بات حادث ہو جاتی تو اس کے بالا افسر کے کھاتے میں چلی جاتی کیونکہ یہ تصور کر لیا گیا تھا کہ مذکورہ بالا صفات کی اجارہ داری صرف افسروں کے پاس ہے۔ چھوٹے ملازمین سے اسی طرح کام لے لیا جانا چاہیے جس طرح کا شتکار بیل یا ٹریکٹر سے کام لیتا ہے۔ انفرادیت اور استحصالی رویوں کے اس ماحول میں کسی کو کیا پڑی تھی کہ قومی سطح پر سوچتا یا بے لوث خدمتِ وطن کی طرف قدم بڑھاتا۔ تارکینِ وطن کی لائی ہوئی تہذیب کا یہی تقاضا تھا۔'' (۲۲)

اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان تارکین وطن نے ہمارے شہروں پر آ کر قبضہ کر لیا اور پھر تعلیم، میڈیا اور تجارت ان کے گھر کی لونڈی ٹھہری۔ مذہب کی بنیاد پر یہاں کی شانت تہذیب میں توڑ پھوڑ کرنا ان کا وتیرہ بن گیا اور آج ستر برس بعد ہم اس مخمصے کا شکار ہیں کہ جائیں تو آخر جائیں کہاں؟

''نوکری کے آخری دس سال'' تیرھواں باب ہے۔ اس باب میں انھوں نے 1961ء سے 1971ء تک کی ملازمت کے احوال بیان کیے ہیں اور بتایا ہے کہ ہمارا سکول ڈیپارٹمنٹ کی حالت کتنی ناگفتہ بہ ہے اور انہوں نے کس طرح ذاتی کاوشوں سے اپنے سکول کی حالتِ زار کو سنوارا اور اسے ڈسٹرکٹ کا بہترین ادارہ بنا دیا۔ اسی باب میں انھوں نے اپنی مالی پریشانیوں کا ذکر بھی کیا ہے اور مظفر گڑھ سے ملتان ہجرت اور پھر یہیں مستقل سکونت کے احوال بھی بیان کیے ہیں اور ملتان میں آ کر انھوں نے قرآن حکیم کا سرائیکی زبان میں ترجمہ،

Scanned with CamScanner

قصیدہ بردہ شریف کا ترجمہ اور ایجوکیشنل فلاسفی آف دی ہولی قرآن لکھی۔ اس باب کے آخر میں لکھتے ہیں:

''میری مالی حالت بے حد کمزور رہی۔ کبھی کوئی بینک بیلنس تھا ہی نہیں۔ ملتان میں ریڈیو پاکستان کا اجرا ہوا تو پروگرام ملنے لگے۔ ان کا معاوضہ بہت قلیل تھا تاہم سگرٹ کا خرچ نکلنے لگا۔ مہمان نوازی کا ذمہ بیگم نے اٹھا رکھا تھا۔ مکان کا کرایہ بھی وہی وصول کرتی تھیں اور مرمت وغیرہ اور دیکھ بھال کے اخراجات بھی اسی آمدنی میں پورے کرتی تھیں۔ ریڈیو سے تقریریں، فیچر، کہانیاں، بچوں کے پروگرام، نظمیں، مذاکرات وغیرہ ''جمہور کی آواز'' کے مستقل پروگرام کے لیے مقالات نشر کیے۔ پندرہ سال تک یہ سلسلہ باقاعدگی سے جاری رہا اور دو ہزار سے زائد تحریریں اس ادارے کو دے دیں۔ پھر صحت کی خرابی کے باعث یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ تاہم پروڈیوسر صاحبان خاص مواقع پر اب بھی گھر پر آ کر ریکارڈنگ کر جاتے ہیں۔ ٹیلی وژن سے بھی پانچ چھ پروگرام ٹیلی کاسٹ کیے۔ 1974ء میں سرائیکی ادبی بورڈ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا اور اسے رجسٹرڈ کرا لیا۔ اس ادارے کو حکومت کی طرف سے گرانٹ ملنے لگی تو کتابوں کی اشاعت میں کچھ سہولت پیدا ہو گئی۔ 1975ء میں سرائیکی ادبی کانفرنس منعقد ہوئی۔ چند سیاسی لوگوں نے خالص ادبی مقاصد کو سبوتاژ کر دیا تاہم سرائیکی کی ترویج اور نشر و اشاعت کا کام جاری رہا۔ اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور نے ایم۔اے سرائیکی کے اجراء کا فیصلہ کیا تو اس کے سلیبس بنانے میں مدد دی۔ زکریا یونیورسٹی کے لیے بھی سلیبس بنایا لیکن یہاں ابھی تک کلاسیں جاری نہیں ہوئیں۔''(۲۳)

آخری باب ان کے علمی، ادبی اور تحقیقی کام کی تفصیل پر مشتمل ہے۔ اس باب میں انہوں نے 1949ء سے لے کر اپنی خودنوشت کی تکمیل تک 37 کتابوں کا حوالہ دیا ہے۔ ان کے علاوہ اپنے لکھے ہوئے دیباچے، فلیپ اور تقریظوں کی فہرست کے ساتھ ساتھ ان دیباچوں اور مقالات کی تفصیل بھی پیش کی ہے جو ان کے فن اور شخصیت پر لکھے گئے ہیں۔

زیرِ نظر خودنوشت ''جو ہم پر گزری'' کا شمار اردو میں لکھی گئی کامیاب خودنوشتوں میں ہوتا ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق اردو کی پہلی سوانح عمری پتمبر سنگھ کی تحریر کردہ ''سیر الاسلام'' ہے جو 1820ء میں لکھی گئی۔(۲۴)

اس طرح شہر بانو کی خودنوشت ''بیتی کہانی'' 1885ء اور عبدالغفور نساخ کی خودنوشت 1886ء اور جعفر تھانیسری کی خودنوشت ''تواریخِ عجیب عرف کالا پانی'' 1890ء کی ہے۔(۲۵)

ان کے ساتھ ساتھ 1857ء کے بعد ظہیر دہلوی نے ''داستانِ غدر'' کے عنوان سے بھی ایک خودنوشت لکھی تھی۔ ان کے بعد بیسویں صدی میں تو خودنوشتوں کی ایک بہار آ گئی اور حسرت موہانی، چودھری افضل حق، حکیم احمد شجاع، مولانا عبدالرزاق کانپوری، مرزا فرحت اللہ بیگ، سید ہمایوں مرزا، عبدالمجید سالک، شاد عظیم آبادی، رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر یوسف حسین خان، مولانا حسین احمد مدنی،

Scanned with CamScanner

جوش ملیح آبادی، سر ظفر اللہ خان، احسان دانش، کلیم الدین احمد، مشتاق احمد خان، سبط حسن، شورش کاشمیری، ڈاکٹر سید عبداللہ، میرزا ادیب، ضمیر جعفری، قدرت اللہ شہاب اور الطاف گوہر وغیرہ نے کامیاب خودنوشتیں لکھیں۔ ان خودنوشتوں میں زیرِ نظر خودنوشت ''جو ہم پہ گزری'' اس لیے بھی لائقِ توجہ ہے کہ اس میں تقریباً پوری بیسویں صدی کے اہم سیاسی، سماجی اور ادبی حالات اور واقعات کو دلکش اسلوب میں پیش کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ سرائیکی زبان، ادب، تہذیب اور ثقافت کا بیان بھی خوب ہے اور بین السطور سرائیکی وسیب کی محرومیوں اور دکھوں کی کسک بھی موجود ہے۔

یہ خودنوشت چودہ ابواب میں منقسم ہے جس کا آغاز مہر صاحب کے خاندانی پس منظر سے ہوتا ہے اور اختتام ان کی وفات سے چند برس پہلے کے حالات پر ہوتا ہے۔ اس طرح یہ خودنوشت ایک شخص کی نہیں رہی بلکہ سرائیکی وسیب کی بیسویں صدی کی خودنوشت ہے کیونکہ اس میں ذاتی احوال و آثار کے بیان کے ساتھ سرائیکی وسیب کے متنوع لسانی، سیاسی، تعلیمی، معاشی اور تہذیبی خدوخال کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، تنقیدی اصطلاحات (توضیحی لغت)۔ لاہور، سنگ میل، ۲۰۱۱ء۔ ص ۱۵

۲۔ ایضاً۔ ص ۱۵

۳۔ مولانا غلام رسول مہر، آپ بیتیوں کی اہمیت، مشمولہ مضمون نقوش (آپ بیتی نمبر)، لاہور، سن نامعلوم۔ ص ۳۸

۴۔ مشفق خواجہ، مختصر آپ بیتیاں، مشمولہ مضمون الزبیر، (آپ بیتی نمبر) سن نامعلوم۔ ص ۴۵

۵۔ الطاف فاطمہ، اردو میں سوانح نگاری کا ارتقا، ناشر اور سن نامعلوم، ص ۲۱

۶۔ صدیقی، ابوالاعجاز حفیظ، ادبی اصطلاحات کا تعارف، لاہور، اسلوب ۲۰۱۵ء۔ ص ۷

۷۔ طاہر تونسوی، ڈاکٹر، کو مہر عبدالحق، ڈاکٹر، کا دیا گیا انٹرویو، مشمولہ سہ ماہی ادبیات اسلام آباد۔ شمارہ ۲۳ بہار ۱۹۹۳ء اسلام آباد۔ اکادمی ادبیات، پاکستان، ۱۹۹۳ء ص ۲۱۳

۸۔ مہر عبدالحق، ڈاکٹر، ''جو ہم پہ گزری'' غیر مطبوعہ خودنوشت مملوکہ راقم (عکسی نقل، سن ندارد)۔ ص ۲

۹۔ ایضاً۔ ص: ۳

۱۰۔ ایضاً۔ ص: ۴

۱۱۔ ایضاً۔ ص: ۵

Scanned with CamScanner

۱۲۔ایضاً۔ص؛۱۰

۱۳۔ایضاً۔ص؛۱۵

۱۴۔ایضاً۔ص؛۴۷

۱۵۔ایضاً۔ص؛۱۱۵

۱۶۔ایضاً۔ص؛۱۲۶

۱۷۔ایضاً۔ص؛۱۴۳

۱۸۔ایضاً۔ص؛۱۵۳

۱۹۔ایضاً۔ص؛۱۵۶

۲۰۔ایضاً۔ص؛۱۵۶

۲۱۔ایضاً۔ص؛۱۷۷

۲۲۔ایضاً۔ص؛۱۸۷

۲۳۔ایضاً۔ص؛۲۲۶

۲۴۔معین الدین عقیل (مرتب)، بیتی کہانی، حیدرآباد دکن، ادارہ علمی، ۱۹۹۵ء ص ۸

۲۵۔عبداللہ سید، ڈاکٹر، وجہی سے عبدالحق تک، لاہور، مکتبہ خیابانِ ادب، ۱۹۷۷ء ص ۵۹

Scanned with CamScanner

''جیسے کلیاں اچھادے کوئی'' ڈاکٹر اکرم عتیق کا منفرد ہائیکو مجموعہ

خورشید بیگ میلسوی

وہاڑی کی ادبی شان ڈاکٹر اکرم عتیق منفرد اور صاحبِ اسلوب شاعر ہیں، جنھوں نے روایت کے وقار اور جدت کے حسن کی کشش کو آمیز کر کے غزل گوئی سے آغاز کیا تو وہاڑی میں ادب کے ضوریز عہد کا آغاز ہوا۔ وہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ادیب ہیں، اس لیے غزل کی مرکزیت کے تادیر اسیر رہے کیوں کہ اردو ادب کا مرکزہ غزل ہی کو ٹھہرایا جاتا ہے جو اس کی حیات وارتقا کی اکائی کا نمایاں مقام ہے۔ قصیدے کا دور گیا، شہنشاہی جمہوری دور میں بدلی، مثنوی بھی عنقا ہوئی، چناں چہ ڈاکٹر اکرم عتیق جو عرصہ دراز سے گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج وہاڑی میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں، ان کی غزلیات کا پہلا مجموعہ ''یاد کا موسم'' اٹھارہ سال قبل شایع ہوا تو ادبی حلقوں نے ان کی منفرد شاعری کو خوش آمدید کہا۔ ۲۰۰۷ء میں غزلیات کا دوسرا مجموعہ ''یہ کبھی سوچا نہ تھا'' شایع ہوا تو یہاں کی غزل میں وہ رجحان ساز شاعر کہلائے، تاہم اس سے قبل انھوں نے منظوم پہیلیوں پر مشتمل مجموعہ ''چاند میں سورج قید ہوا'' کے نام سے شایع کیا تا کہ نوعمر اور نوجوان طبقہ شعر کی رمز سے آشنا ہو۔

بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ ڈاکٹر اکرم عتیق اردو میں ہائیکو کو اس کے تمام لوازم وشرائط کے ساتھ کہنے والے پہلے شاعر ہونے کا اعزاز رکھتے ہیں۔ ہائیکو پر ان کی کتاب ''جیسے کلیاں اچھال دے کوئی'' ۱۹۹۴ء میں شایع ہو کر پذیرائی حاصل کر چکی ہے۔ جہاں تک اردو ہائیکو کا تعلق ہے تو بیسویں صدی کے شاعرانہ تفکر میں ایک رجحان ساز موڑ کی صورت میں یہ ادبی صنف آغاز ہوئی۔ یہ وہ دور تھا جب موضوعاتِ شعر بدل رہے تھے، برِصغیر کے شعرا عالمی شعروادب سے جڑ چکے تھے، نظم کے نئے موضوعات اس کا ثبوت ہیں۔ چناں چہ نئی ہیئتوں کو منصۂ شہود پر آنے کے لیے سہل اور ہموار راستہ ملا، دوسرے ممالک میں مروجہ اصناف اردو ادب میں داخل ہوئیں۔ ہائیکو بھی اسی نوع کا ہیئتی تجربہ ثابت ہوا۔ یہ جاپانی صنفِ سخن ہے، جاپان میں مختصر نظموں کا رواج پہلے سے موجود تھا۔ اس کا موازنہ ہم ایران کی رباعی اور ہندوستان کے دوہے سے کر سکتے ہیں۔ ہائیکو سہ مصرعی ''ہائی کائی'' سے ماخوذ ہے اور باشو اس کا پہلا شاعر مانا جاتا ہے۔ ہائیکو کو ''ہوکو'' کی بدلی ہوئی تصویر بھی مانا جاتا ہے۔ یہ جاپان سے برِصغیر میں آئی اور پھر ہمارے شاعر اکرم عتیق نے اس پر مشقِ سخن کی۔ اپنے ہائیکو مجموعے کی ابتدا میں انھوں نے ہائیکو سوسائٹی آف امریکہ کی ہائیکو سے متعلق مدون کردہ تعریف بھی انگریزی زبان میں درج کی ہے۔ محققین وشعرا کے مطابق ہائیکو ایک مختصر نظم ہے جو تصوراتی زبان سے موسم یا فطرت کے تجربے کی روح کا انسانی صورتِ حال سے جڑا اظہار ہے۔ ڈاکٹر اکرم عتیق کے ہائیکو کے بارے میں شہزاد احمد رقم طراز ہیں:

> ''اکرم عتیق صاحب کے دل میں فطرت کے مناظر اور تبدیل ہونے کے عمل کے باوجود ایک اکائی کی صورت میں قائم رہنے والی دنیا کے لیے ایک نرم گوشہ موجود ہے، وہ چیزوں کو دیکھنے اور محسوس کرنے کے لیے بھی اپنے مخصوص زاویے رکھتے ہیں اور انھوں نے یہ کوشش بھی کی ہے کہ ہائیکو کی جو کلاسیکل تعریف اردو میں مروج ہے اس کے قریب تر رہیں۔ اس عمل میں انھوں نے جو کچھ تخلیق کیا ہے وہ دامنِ دل کو کھینچتا ہے۔''

یوں ان کی اس ادبی کاوش میں فنی مہارت اور ریاضت سے انکار ناممکن ہے۔ اس سلسلے میں لفظیات کا انتخاب ہو یا موسم اور

Scanned with CamScanner

فطرت کی حالت کا، انھوں نے ہائیکو میں انفرادیت کو اجاگر کیا ہے۔ اس سلسلے میں کچھ ہائیکو دیکھیے جو ان کے زیرِ نظر مجموعے میں موجود ہیں:

ٹہنیاں رقص میں ہوئیں مصروف / پتے تالی بجا بجا اچھلے / باغ میں جب ہمارا پھول آیا

یوں کبوتر اڑے درختوں سے / جیسے کلیاں اچھادے کوئی / زلزلہ کس قدر اچانک تھا

جس کبوتر سے پیار ہے تم کو / اس کو چھوڑو کھلی فضاؤں میں / لوٹ آئے تو پھر تمھارا ہے

میرے گاؤں کی ایک پگ ڈنڈی / جس کی اطراف میں کھلے ہیں پھول / روز کرتی ہے انتظار ترا

پھول ہاتھوں میں لے کے جا پہنچی / شوخ سی بیل اس کی کھڑکی تک / مجھ میں اتنا بھی حوصلہ نہ ہوا

چوں کہ شاخوں پہ کوئی پھول نہیں / تتلیاں باغ میں نہیں آتیں / بیچ دی باغ باں نے کیوں رونق

کٹ گئے سال ہا پرانے پیڑ / ہوگئی سنگ و خشت کی بھرمار / باغ سے کوچ کر گئے پنچھی

ڈاکٹر اکرم عتیق نے فطرت اور موسم کو مرکزی حوالہ بنا کر مختلف صورتیں بیان کر کے اپنی فنی مہارت کا بہ خوبی اظہار کیا ہے۔ معروف نقاد ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا رقم طراز ہیں:

> ''اکرم عتیق کا یہ مجموعہ ہائیکو کی صنف پر ان کی عمدہ تخلیقی گرفت کا مظہر ہے۔ انھوں نے اس بیرونی صنف کو مقامی رنگ کے ساتھ ملا کر ایسی شاعری تخلیق کی ہے جس میں وطن کی مٹی کی باس بھی شامل ہے اور نازک احساسات کا اظہار بھی۔''

ڈاکٹر اکرم عتیق ہائیکو کی ہیئت کے حوالے سے معروف ہائیکو نگار ڈاکٹر محمد امین کے ہائیکو کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ ''ہائیکو کے بعض شاعروں کی طرح میرے لیے بھی بحرِ خفیف مسدس ہی موزوں ٹھہری۔'' اس حوالے سے مزید تائیدی کلمات ڈاکٹر شبیر احمد قادری ''جیسے کلیاں اچھال دے کوئی'' کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''ڈاکٹر محمد امین اردو ہائیکو کے لیے بحرِ خفیف مسدس کو موزوں قرار دیتے ہیں اس لیے کہ یہ بحر نہ صرف ہمارے ہاں عام مستعمل ہے بلکہ ہمارے الفاظ کی بیش تر صورتوں کا بہ خوبی احاطہ کرتی ہے۔ یہی بحر اکرم عتیق کی پسندیدہ بحر ہے۔''

یوں مذکورہ نابغہ روزگار نقادانِ سخن نے جہاں ہائیکو کے بارے میں قاری کی راہ نمائی کی ہے وہاں اس حوالے سے ڈاکٹر اکرم عتیق کے احتیاطِ سخن کو بڑی خوب صورتی سے سراہا ہے، جس کی وجہ شاعر کا فطری رجحان ہے اور وہ تخلیقی توانائی ہے جو انھوں نے بے حد مہارت اور فنی احتیاط کے ساتھ اپنی تخلیق میں استعمال کر کے ہائیکو پر مشتمل ادبی سرمایے میں ایک خوب صورت اضافہ کیا ہے۔ یوں ہائیکو

Scanned with CamScanner

پر تخلیقی کام کا جب بھی ذکر آئے گا تو ہر صورت ڈاکٹر اکرم عتیق کے مجموعے ''جیسے کلیاں اچھال دے کوئی'' کا نام بھی حوالے کے طور پر آئے گا۔ کچھ اور ہائیکو ملاحظہ کیجیے:

دل کے اندر ہے ایک سبز درخت / میں اسے سوکھنے نہیں دیتا / اس پہ رہتا ہے آس کا پنچھی

گھر میں تکرار دیکھ کر اک دن / اڑ گئی گھونسلے سے اک چڑیا / اور پھر لوٹ کر نہیں آئی

شاخِ زیتون چونچ میں لے کر / چھپ گئی فاختہ کہاں جانے / اس کے دیدار کو ترستے ہیں

کل ترا انتظار کرتے ہوئے / سر سے پاؤں تلک میں بھیگا تھا / تُو نہ آیا تو رو پڑے بادل

جانے کیوں کر بپھر گیا پانی / کتنی فصلیں تباہ کر ڈالیں / یہ نمو کا بھی استعارہ ہے

کچی بستی کے رہنے والے لوگ / اپنے گھر دیکھتے ہیں حسرت سے / آج بارش ہے خوب زوروں پر

مٹتے جاتے ہیں جنگلوں کے نشان / بڑھتی جاتی ہے دھند، دھول، دھواں / سانس لینے کو جی نہیں کرتا

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے ان کے ہائیکو کی انفرادیت کی خوش بو کے بارے ہماری خوب راہ نمائی کی ہے کہ گو یہ صنف جاپانی ہے مگر ہائیکو میں مقامی رنگ ڈاکٹر اکرم عتیق کی ریاضت، مشاہدہ اور نرالی حسیت سے آیا ہے۔ خدا نے انھیں علمِ کلام و بیان کی جو توانائیاں دی ہیں، انھیں ہائیکو کے ارتقا کے لیے استعمال کرنے میں انھوں نے کہیں بھی بخل سے کام نہیں لیا اور اسی کشادہ ظرف نے اتنے خوب صورت ہائیکو قاری کو عطا کیے ہیں کہ جن کے جمالِ ظاہر و باطن میں وہ کھو کر رہ جاتا ہے اور اسے یہ صنفِ سخن اجنبی معلوم نہیں ہوتی۔ اپنے ہائیکو میں عشق و محبت کے ساتھ ساتھ طلبِ امن، سیلِ بلا، بارشوں کے اثرات وغیرہ سے انھوں نے ہمیں تصویر گری کے فن سے آشنا ہونے کا جو تاثر دیا ہے وہ ان کی فنی پختگی اور ہائیکو نگاری میں کامل گرفت کا مظہر ہے۔ ''جیسے کلیاں اچھال دے کوئی'' میں تصویر گری کا کمال و ہنر اور زیبائش و آرائش میں مناسب ترین لفظیات کا محتاط چناؤ آنکھ سے ذہن تک سفر کر کے ایسی تصویریں سامنے لانے میں کام یاب رہتا ہے، جن کا سحر پڑھنے والوں کو تادیر اپنی گرفت میں سرشار رکھتا ہے۔ جس کی بنا پر اس ہائیکو مجموعے کی شاعری آفاقیت کی حدوں کو چھوتی ہوئی نظر آتی ہے۔

ہم اپنا مضمون پی ٹی وی پر کلیاں پروگرام پیش کرنے والے فاروق قیصر کی دل آویز رائے پر تمام کرتے ہیں:

> ''اکرم عتیق کی خوب صورت، انوکھی اور پُر حقیقت سوچ دل کی گہرائیوں میں اتر کر ہمیشہ کے لیے گھر کر جاتی ہے۔ یہی کچھ میرے ساتھ بھی ہوا، میں اکرم کا کلام بار بار پڑھ کر کئی روز تک یہ سوچ کر خالی خالی سا پھرتا رہا کہ میری اور اکرم کی شاعرانہ سوچ میں اس قدر مماثلت ہے کہ جیسے ہمارے الفاظ ایک دوسرے کے کزن ہوں۔''

Scanned with CamScanner

علامہ اقبال کی شاعری اور اساطیر

ڈاکٹر تقدیس زہرا

اساطیر کسی بھی خطے، قوم، تہذیب یا افراد کی کہانیاں ہوتی ہیں۔ یہ قصے اپنی نوعیت کے اعتبار سے اخلاقی، اصلاحی، تاریخی اور مذہبی حوالوں سے متصف ہوتے ہیں۔ انہیں دیومالا، صنمیات، علم الاصنام یا Mythology کہا جاتا ہے۔ اردو ادب میں یہ اساطیر ہمیں نظم و نثر ہر دو جگہ دکھائی دیتی ہیں۔ یعنی ہمیں داستان، ناول، افسانہ، ڈراما، غزل، مثنوی، نظم، مرثیہ، غرض تمام اصناف میں ان کا وجود ملتا ہے اور یہ اپنی اہمیت اور تاثیر ہم پر ثابت کرتی نظر آتی ہیں۔ شعری اور نثری تمام اصناف میں یونانی، رومی، ہندی، اسلامی اور مقامی اساطیر جلوہ گر ہیں۔

اردو شاعری کا کلاسیکی دور ہو یا جدید دور، یہ تمام اساطیر ہماری توجہ اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ اس ضمن میں ان کا بیان مختلف اسالیب اور لہجوں پر مبنی ہے اور یہ مختلف اسالیب ان اساطیر کے متنوع اثرات ہم پر واضح کرتے ہیں۔ اردو شاعری کے قدیم یا جدید کسی بھی دور، تحریک یا رجحان کے تحت کی گئی شاعری پڑھ کے دیکھ لیں یہ اساطیر کسی نہ کسی انداز سے ہمیں مل جائیں گی۔ ادب کے شعبے میں ان کا بیان اور ان کی تاثیر دونوں ہی منفرد اور موثر ہیں۔

بیسویں صدی کے شاعروں میں علامہ اقبال اس حوالے سے بہت منفرد ہیں کہ انہوں نے اساطیر سے وہ کام لیا ہے جو کسی اور نے اس طرح سے نہیں لیا۔ اقبال کا انداز، لہجہ اور اسلوب ہر طرح سے بے مثال ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ شاعری کو دل پر اتری کسی وحی کی طرح پیامی اور مقصدی بنانا چاہتے تھے مگر اس طریق پر کہ بیان کا شعری حسن مجروح نہ ہونے پائے اور مقصد بھی حاصل ہو جائے۔ اپنے مافی الضمیر کو انہوں نے شعری تمثالوں، تاریخی حوالوں اور اساطیری شخصیات کی مثالوں سے خوب واضح کیا ہے۔ دراصل ان کی مدد سے اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتے تھے۔ وہ مقصد یہ تھا کہ اقبال ماضی کی ان کہانیوں کو مثال بنا کر زمانۂ حال کے انسان سے حرکت اور عمل کی قوی توقع رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر نظم ''تصویر درد'' کا یہ شعر:

Scanned with CamScanner

شجر ہے فرقہ آرائی، تعصب ہے ثمر اس کا
یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو

ماضی، حال اور مستقبل دراصل وقت کے بہتے ہوئے دھارے کا حصہ ہیں اور اسی تسلسل اور عمل میں زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔ اقبال اساطیر سے متحرک زندگی کا کام لینا چاہتے ہیں۔ وہ انہیں کوئی جامد تصور یا شے نہیں سمجھتے بلکہ انہیں زندہ حقیقت اور متحرک تصویر خیال کرتے ہیں۔ ''بانگ درا'' سے چند مثالیں پیش خدمت ہیں:

ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لیے
تو تجلی ہے سراپا چشمِ بینا کے لیے

.....

ایک پتھر کے جو ٹکڑے کا نصیبا جاگا
خاتمِ دستِ سلیماں کا نگیں بن کے رہا

ان اساطیر کے ضمن میں کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اسلامی، ہندی، مصری، ایرانی اور عربی اساطیری حوالوں سے جا بجا اپنی شاعری میں مؤثر کام لیا ہے۔ وہ اس سرمائے کو بخوبی استعمال کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ حربے ان کا ہنر اور سلیقہ بن کر نمودار ہوتے ہیں اور اپنے معنی خیز جلوے سے سب کو متاثر کرتے ہیں۔ اس ضمن میں چند مثالیں پیش خدمت ہیں:

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا
میں ہلاکِ جادوئے سامری تو قتیل شیوۂ آزری
نہ سیتزہ گاہِ جہاں نئی نہ حریفِ پنجہ فگن نئے
وہی فطرتِ اسلامیہی، وہی مرحبی وہی عنتری

(میں اور تو)

خونِ اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسمِ سامری
سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری

(خضرِ راہ)

Scanned with CamScanner

یہ متحرک اور پُر جوش مثالیں ان کی شاعری کو بھی تحرک عطا کرتی ہیں اور ایک امید ایک مسلسل عمل ان کی شاعری میں اپنی جگہ بنا
ل لیتا ہے۔ اسی رجائیت سے ان کی تمام شاعری مملو ہے۔ چند اور مثالیں دیکھیے:

آگ ہے اولادِ ابراہیم ہے نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

.....

تو نے یہ کیا غضب کیا، مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

.....

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے، اب مرا انتظار کر

.....

اگر دیکھا بھی اس نے سارے عالم کو تو کیا دیکھا
نظر آئی نہ کچھ اپنی حقیقت جام سے جم کو

.....

وہی اک حسن ہے لیکن نظر آتا ہے ہر شے میں
یہ شیریں بھی ہے گویا، بے ستوں بھی، کوہ کن بھی ہے

.....

وادیٔ نجد میں وہ شورِ سلاسل نہ رہا
قیسِ دیوانۂ نظارۂ محمل نہ رہا

.....

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسینؑ ابتدا ہے اسمٰعیلؑ

نظم "نیا شوالہ" کے چند اشعار:

Scanned with CamScanner

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو بُرا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

نظم ''عبدالقادر کے نام'' سے ایک بند:

رختِ جاں بت کدۂ چیں سے اٹھالیں اپنا
سب کو محوِ رخِ سعدیٰ و سلیمیٰ کر دیں
دیکھ یثرب میں ہوا نافۂ لیلےٰ بیکار
قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کر دیں

دراصل یہ آرزوئے نو یہ حرکت یہ عمل وہ اپنی قوم میں دیکھنا چاہتے تھے۔ خصوصاً اپنی قوم کے نوجوانوں میں، لیکن اس مقصد کے لیے ان کا کہنا تھا کہ:

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

یہ اضطراب، یہ طوفان صرف حرکت و عمل ہے۔ اس سے مراد کوئی حادثہ یا طوفان یا کوئی سانحہ نہیں بلکہ اس سے مراد محض قوتِ ارادی ہے جو انسان کو متحرک رکھتی ہے اور منزل تک پہنچاتی ہے۔

☆☆☆☆

Scanned with CamScanner

خدیجہ مستور کے دو ناول

غلام دستگیر رہانی

اردو ناول کے ارتقا کو اپنی آسانی کے لئے تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور ڈپٹی نذیر احمد کے مراۃ العروس (دلہن کا آئینہ 1869ء) سے شروع ہوا اور پریم چند کے ناولوں تک (1936ء) پانچ کر اختتام پذیر ہوا۔ اسلوب احمد انصاری نے اپنی کتاب اردو کے پندرہ ناول میں میر امن کی داستان باغ و بہار کو ناول شمار کیا اور خدیجہ مستور کے ناول آنگن کو نویں (۹ ویں) نمبر پر بحث میں لائے۔ فسانہ آزاد (رتن ناتھ سرشار) اور امراؤ جان ادا (رسوا) دو ایسے ادبی واقعات ہیں جن کے بغیر اردو نثر اور ناول کی تاریخ نامکمل ہے۔ سرشار کے ناول کو صحافتی اور کلچرل ناول بھی کہا گیا۔ لیکن ٹیکنیک اور ناول کے منفرد مزاج آشنا مرزا ہادی رسوا ہی کہلائے۔ ناول کا دوسرا دور 1936 تا 1959ء تک بھرپور ہے جس میں ترقی پسند ناول نگاروں کے ناولوں کے ساتھ ساتھ قرۃ العین حیدر کا شاہکار آگ کا دریا سامنے آیا جو رجحان ساز ناول ثابت ہوا جس میں ڈھائی ہزار سال پر مشتمل تاریخی، سیاسی اور سماجی شعور کو ناول کی زبان دی گئی، اس میں مختلف زمانوں کی کہانیوں کا وسیع کنویس تیار کیا گیا۔ اردو ناول نگاری کی تاریخ میں یہ ناول ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ قرۃ نے اس ناول کو ۵۷ء میں لکھنا شروع کیا۔ اور یہ دو سال بعد منظر عام پر آیا۔ قرۃ نے اپنی ادبی زندگی میں کئی دوسرے ناول اور ناولٹس بھی لکھے جن میں آخر شب کے ہم سفر، سفینہ غم دل، میرے بھی صنم خانے، چاندنی بیگم، کار جہاں دراز ہے (سوانحی ناول) جدید عہد میں عبداللہ حسین بڑے ناول نگار کے طور پر ایک عرصہ چھائے رہے۔ ان کا ناول اداس نسلیں 63 یعنی تیسرے یا موجودہ دور میں سامنے آیا۔ انھوں نے باگھ، نادار لوگ اور قید جیسے ناول تحریر کئے اور بعض انگریزی تحریروں کے ذریعے خود کو مغربی دنیا میں متعارف کروایا۔

1959ء سے موجودہ عہد تک (اس کے ایک سال بعد یعنی 1960 میں افسانے اور ناول نے موضوع اور ٹیکنیک کی سطح پر نئی کروٹ لی)۔ اردو کے اچھے اور شاہکار ناولوں کی تعداد بہت کم ہے لیکن موضوع کے اعتبار سے ہر طرح کے ناول مل جاتے ہیں جن میں بیانیہ، حقیقت پسندانہ، سماجی، رومانی، علامتی اور وجودی ناول لکھے گئے ہیں۔ حقیقت نگاروں نے عالمی سطح پر ناول کے میڈیم کو استعمال کرتے ہوئے سلگتے ہوئے انسانی مسائل پر ناول لکھے تو ناول کی اہمیت کو تسلیم کیا جانے لگا۔ اور انکی دیکھا دیکھی متحدہ ہندوستان میں بھی ناول لکھے جانے لگے جن کے کردار بادشاہ اور نواب نہیں بلکہ کسان، استاد، اندھے فقیر ہوتے تھے۔

حقیقت نگاروں نے عالمی سطح پر سلگتے ہوئے انسانی مسائل پر ناول لکھے تو ناول کی اہمیت کو تسلیم کیا جانے لگا۔ اور انکی دیکھا دیکھی

Scanned with CamScanner

متحدہ ہندوستان میں بھی ناول لکھے جانے لگے جن کے کردار بادشاہ اور نواب نہیں بلکہ کسان، استاد، اندھے فقیر ہوتے تھے۔ افسانہ و ناول نگار خدیجہ مستور کے دو ناول آنگن 1962 اور زمین 1983 میں منظر عام پر آئے۔ انھوں نے گھرانوں کی سیاست اور اس سیاست کے خواتین پر اثرات کو موضوع بنایا اور سیاسی بحث کو اس وقت کی ملکی سیاست سے جوڑ دیا، آنگن اور زمین۔ دونوں ناول موضوعاتی تسلسل اور توسیع رکھتے ہیں، (ناول زمین وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں سے ناول ''آنگن'' ختم ہوا) ناول آنگن میں تقسیم ہند سے پہلے کے (متحدہ) ہندوستان کی اور ناول زمین میں قیام پاکستان کے فوراً بعد کی صورتحال بیان کی گئی ہے۔

بھارت میں یہ ناول پٹنہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر اسلم آزاد کے مقدمے کے ساتھ شائع ہوا۔ ان کا بھی پہلا جملہ یہ تھا کہ ''آنگن ایک متوسط طبقے کے مسلم گھرانے کے آنگن کے مسائل کی بنیاد پر لکھا گیا ہے لیکن گھر کی چہار دیواری میں محدود یہ آنگن برصغیر کے ہر گھر کا آنگن بن گیا ہے''

خدیجہ مستور ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھیں۔ وہ ہر طرح کے جبر اور ظلم کے خلاف تھیں۔ خدیجہ مستور کے دونوں ناولوں میں ان کی ترقی پسندی واضح طور پر محسوس ہوتی ہے۔ وہ انسانیت کا درد رکھتی تھیں۔ سادہ بیان، بناوٹ اور سجاوٹ کے بغیر براہ راست اپنے پیغام کو قاری تک پہنچاتی تھیں۔ انھیں ناول کی روایت کا مکمل شعور تھا۔ ان سے قبل نذر سجاد، حجاب امتیاز علی، عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر سمیت کئی ناول نگار خواتین اپنے اپنے انداز میں ناول تحریر کر چکی تھیں، ناول ترقی یافتہ شکل میں ان کے سامنے موجود تھا لیکن وہ ناول نگاری میں قرۃ العین حیدر جیسا نام و مقام نہ پا سکیں۔ ناول آنگن کو ڈاکٹر احسن فاروقی، ڈاکٹر عبدالسلام اور دوسرے کئی ناقدین نے پسند کیا۔ خدیجہ مستور بنیادی طور پر افسانہ نگار تھیں انکے ناولوں میں بھی افسانوں جیسا ٹریٹمنٹ دکھائی دیتا ہے، جیسے چھوٹی چھوٹی کہانیاں جوڑ کر ایک طویل کہانی بنا دی ہو۔ آنگن میں پاکستان کی تاریخ کے حوالے سے اقدار کی شکست و ریخت اور معاشرتی تبدیلیوں کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ جنھوں نے انسانی زندگی میں مسائل پیدا کیے جن میں سب سے بڑا مسئلہ آدرشوں کی شکست و ریخت ہے۔

اسلوب احمد انصاری نے اپنی کتاب ''اردو کے پندرہ ناول'' میں ناول آنگن کو ایسا خانگی المیہ کہتے ہیں جس کا دائرہ کار محدود اور متعین ہے لیکن انکے نزدیک ''یہ محدودیت اسکی وقعت کو کسی طرح کم نہیں کرتی۔ ناول میں زمین دار خاندان کے چار بھائیوں، دو بہنوں اور ان کی اولادوں کے گرد تانا بانا بنا گیا ہے۔

ناول میں شامل کسم کی کہانی اس کی زندگی اور پھر خودکشی سے پیدا ہونے والا المیہ۔۔ ناول کی کہانی کو با اثر بنا دیتا ہے۔ ناول کے کردار عالیہ اور چھمی۔ کرب اور گھٹن جیسے مسائل سے دوچار ہوتے ہیں۔ آنگن کی عالیہ ناول کا مرکزی کردار ہے۔ اس کے ابا مظہر چچا انگریز مخالف ہیں اور بڑے چچا کٹر کانگریسی ان کرداروں کے ذریعے نظریاتی اور سیاسی سوچ کو واضح کیا گیا اور بتایا کہ الگ وطن کے حصول کے لئے لیڈروں کے ساتھ ساتھ عام لوگوں نے کس کس سطح پر قربانیاں دیں۔ عالیہ کے والد کا جیل جانا اور جیل میں انتقال ایک اہم واقعہ۔

اسرار میاں کا کردار (عام ناولوں سے ہٹ کے، بظاہر غیر اہم (جو ڈیوڑھی میں پڑے رہتے ہیں) گھر کے اندر جانے کی اجازت نہیں کہ ان کا درجہ ناجائز اولاد کا ہے) اس کردار سے کام لیا گیا ہے۔ چھمی کا کردار شوخ اور کریمن بوا بھی ذیلی کرداروں میں اہم اور فعال ہیں۔ دوسرے کرداروں میں تہمینہ باجی، اماں، صفدر بھائی، جمیل بھائی، شکیل، انگریز بھابھی اور کئی ذیلی کردار شامل ہیں۔ کسم عالیہ کی بہن ہے جو اپنے پھوپھی زاد صفدر سے محبت کرتی ہے۔ جب اسکی شادی کسی اور جگہ ہونے لگتی ہے تو وہ خودکشی کر لیتی ہے۔ عالیہ کے ساتھ جمیل محبت کا ہاتھ بڑھاتا ہے لیکن کسم دیدی کی خودکشی کے بعد عالیہ کو مردوں سے نفرت ہو جاتی ہے۔ لیکن جب عالیہ پاکستان جانے

Scanned with CamScanner

لگتی ہے تو اسکے دل میں یہ امنگ اٹھتی ہے کہ جمیل کم از کم اسے ایک پیار بھری نظر سے دیکھ ہی لے۔ناول زمین میں عالیہ کی جگہ ساجدہ نے لے لی۔ناول یہ تاثر دیتا ہے کہ تاریخ کے دھارے پر بہتے ہوئے انسان کیا کیا منصوبے بناتا ہے اور کنارے آ لگنے پر سوچ، فکر اور خوابوں کے تمام مناظر بدل جاتے ہیں۔خدیجہ مستور تاریخ اور سیاست کے دیے ہوئے دکھوں کو اپنا موضوع بنایا۔اخلاقی اقدار کے زوال، استحصالی قوتوں

چہرہ دکھایا جنہوں نے قربانی دینے والوں کی جدوجہد کو بیچ دیا اور اپنے لئے منفعت کے دروازے کھول لئے۔یہاں کے بعض حکمرانوں اور بیوروکریسی نے ملک کی جو حالت بنادی اسکی تصویریں ناول میں دکھائی گئی ہیں۔

خدیجہ مستور کی صاف گوئی۔برجستہ مکالمے اور رواں اسلوب کی چند مثالیں

''عالیہ کو دکھ ہو رہا تھا کہ یہاں تو سب پاگل ہیں

کچھ نہیں ہوتا بس میں مسلمان ہوں اس لئے مسلم لیگی ہوں''

''پانچویں دن ماموں نے ایک چھوٹی سی کوٹھی کا تالا تڑوا کر اماں کو ان کے گھر جانے پر مجبور کیا۔۔۔''

''۔۔۔تخت پر بچھی ہوئی میلی چادر پر کتھے چونے کے پچاسوں دھبے لگے ہوئے تھے''

''۔۔۔۔قریب درختوں کے جھنڈ سے الو کے بولنے کی آواز کی نحوست رات کو اور بھی سنسان کیئے جا رہی تھی''

مین نے اپنی زندگی کی ڈگر کو بدل دیا ہے چچی۔دنیا تباہ ہوتی ہے تو ہو جائے۔۔۔''

آنگن'' کی عالیہ اگرچہ ''زمین'' کی ساجدہ کی طرح حساس ہے۔لیکن دونوں کے رویے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔عالیہ میں خود اعتمادی کی کمی ہے۔وہ سب سے بہت کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن وہ بے باک نہیں۔اسے کسی خاص شخص سے محبت نہیں، اس کے ذہن میں ایک آئیڈیل کا تصور ہے جس کی خصوصیات اسے جمیل کیمپ کے ڈاکٹر اور صفدر میں نظر نہیں آتیں تو وہ اکیلے زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔جب کہ ''زمین'' کی ساجدہ عالیہ کے برخلاف پر اعتماد اور باہمت لڑکی ہے۔ہجرت کے بعد اسے مالک کے گھر میں پناہ لینی پڑتی ہے اور وہ وہاں بھی اپنی حیثیت منوالیتی ہے۔ہجرت کے بعد وہ صلاح الدین سے بچھڑ جاتی ہے، اپنے تحفظ کے لیے اسے ناظم سے شادی کرنی پڑی، لیکن عالیہ کی طرح تنہائی اس کا مقدر نہیں بنتی۔اس کے ساتھ ناظم اور اس کے بچے تھے۔ناول زمین میں مہاجرین کے مختلف رویے بیان کئے گئے ہیں۔''زمین'' حقیقت نگاری کی روایت میں لکھا گیا کرداری، بیانیہ ناول ہے۔جس میں متضاد، طبقاتی رویوں کی عکاسی کی گئی۔صلاح الدین امرا اور جاگیرداروں کے طبقے کا نمائندہ۔کاظم کا تعلق بیوروکریٹس کلاس سے ہوتا ہے۔قیام پاکستان کے ابتدائی برسوں میں جن لوگوں نے ملک کی باگ ڈور سنبھالی یا مختلف اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز ہوئے ان میں سے بیش تر افسران نے مہاجرین کے مسائل کو حل کرنے اور ملک کی ترقی کے لیے سوچنے کے بجائے غیر قانونی طریقے سے اپنی حیثیت اور حقیقت کو بدلا۔بعض مہاجرین ایسے تھے جنھیں ان کی حیثیت کے مطابق جائیداد نہ مل سکی تو وہ لوگ صرف روحانی طور پر زخمی نہیں ہوئے بلکہ وہ معاشی طور پر بھی تنگ دستی اور فاقہ کشی کا شکار ہوئے۔یہ پاکستانی معاشرے کی بدنصیبی کی ابتدا تھی۔

ناول نگار نے اپنے ناول کے کردار ساجدہ کے ذریعے اس وقت کی تمناؤں کو اس خوبصورتی سے بیان کیا کہ اس میں کئی معنی سمٹ آئے۔

''نماز کے بعد لوگ دعائیں مانگ رہے تھے۔جانے وہ کونسی دعائیں مانگ رہے تھے۔ساجدہ کو ایک بار تو ایسا محسوس ہوا کہ اتنے بہت سے پھیلے ہوئے ہاتھوں میں ساری دنیا کی آسائشیں سمیٹ لینے کی تمنائیں پھڑک رہی ہیں''

Scanned with CamScanner

ناول میں کئی مقامات پر اس وقت کے حالات، امنگوں اور خواہشات کا ذکر ملتا ہے اور اس سوچ کا بھی جو منفی اور بے راہ روی کی جانب جانے کو اکساتی ہے۔ ناول نگار نے قومی المیے قائداعظم کی وفات کی خبر اور اس لمحے ذہنوں سے اٹھنے والے خدشات کو لفظوں میں محفوظ کیا۔

ہاں اب کیا ہوگا۔۔۔۔ناظم نے بڑی حقارت سے دیکھا۔کیسی عجیب بات ہے کہ قائداعظم کی وفات کے ساتھ اس ملک کے بے شمار لوگوں کو اس ملک کی موت اور تباہی نظر آ رہی ہے۔لوگ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ اس ملک کا وجود بہت سے لوگوں کی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔۔۔۔۔تاجی اس عہد کی کمزور عورت کی داستان ہے کہ عورت چاہے آزاد ملک کے معاشرے کی کیوں نہ ہو، اگر وہ کمزور اور بے بس ہے تو لوگ اسے اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔تاجی جس کی ماں نے اسے اس امید پر آزاد ملک پاکستان بھیج دیا تھا کہ اپنے ملک میں وہ بالکل محفوظ رہے گی اور کوئی بھی شریف مسلمان مرد اس سے شادی کر لے گا۔لیکن پاکستان میں کاظم نے اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جو ہندوستان میں کوئی غیر مسلم نسلی تعصب کی وجہ سے کرتا۔۔ناول میں خدیجہ مستور نے ساجدہ کی زبانی اپنے احساسات اور جذبات بیان کیے ہیں۔ساجدہ جب تاجی کے کمرے میں جاتی ہے تو بے ساختہ کہتی ہے: ''ویران کوٹھری میں کچے کچے خون کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔طاق میں رکھی ہوئی لالٹین ابھی ٹمٹما رہی تھی۔اس نے تاجی کا میلا سا تکیہ اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔وہ جو مدتوں سے ایک ایک آنسوؤں کو ترس رہی تھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔تاجی، ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب ایسی کوٹھریوں سے کچے خون کی بو نہیں آئے گی۔''

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ''آنگن'' عزم و جدوجہد ہے تو ''زمین'' حصول وطن کے بعد کی صورتحال۔یوں ناول نگار نے ایک ایسی تصویر کو مکمل کیا جسے دیکھنے کے لئے زندگی نے انھیں مہلت نہ دی۔

☆☆☆☆☆.....☆☆☆☆☆.....☆☆☆☆☆

Scanned with CamScanner

مائے نی میں کینہوں اکھاں

حامد علی بیلا ..... ایک درویش منش صاحب اسلوب گلوکار

پروفیسر سلیم الرحمٰن

بشنو از نے چوں حکایت می کُند
و ز جدائی ہا شکایت می کُند
خشک چوب وخشک و تار خشک پوست
از کُجا می آید ایں آوازِ دوست

مولانا روم نے ان اشعار میں موسیقی کے حوالے سے کیا انوکھی اور خوبصورت بات کہی ہے۔امیر خسرو نے بھی شاعری اور موسیقی کو بڑی ہنرمندی سے سلیقے سے شیر وشکر کیا ہے۔فارسی کے علاوہ ہمارے پنجابی شعروادب کے صوفی شعرا۔شاہ حسینؒ، بابا بلھے شاہؒ اور خواجہ غلام فریدؒ (مٹھن کوٹی) جیسے عظیم المرتبت صوفیائے کرام نے بھی اس حوالے سے اپنا کمال علم وفضل دکھایا ہے۔ان تینوں عظیم صوفی شعرا نے شاعری کی صنف کافی میں ایسے اعلیٰ اسلوب میں عشقِ حقیقی، معرفتِ الٰہیہ اور جذب ومستی سے معمور مضامین بیان کئے کہ جنہیں کلاسیک ادب کا درجہ حاصل ہے۔فلسفہ وحدتِ الوجود کی شان وشوکت نے اس صنف کے حسن ملاحت کو ایسا نکھارا کہ بس سبحان اللہ کہیئے۔ان صوفی شعرا کی لکھی ہوئی کافیاں فی الحقیقت ہیں بھی ادب کا شاہکار۔کافی حقیقتاً ایک ایسا نغمہ ہے جو روح سے گایا جاتا ہے اور روح ہی اسے سنتی ہے۔

یہ صوفیائے کرام جہاں تصوف کے اسرار ورموز سے واقف تھے۔فلسفۂ وحدت الوجود کی کُنہ سے بھی کما حقہٗ تعارف وادراک کے حامل تھے۔معاً علم موسیقی، راگ راگنیوں اور ٹھاٹھوں کے بھی خوب خوب رازدان تھے۔

خواجہ غلام فرید مٹھن کوٹی اور بابا بلھے شاہ کے علاوہ ان سے بہت قبل شاہ حسینؒ لہوری نے بھی کافیوں کی صورت میں شاعری اور موسیقی کو اس جذب ومستی اور قلبی کیفیت سے یکجا کیا کہ سبحان اللہ، سبحان اللہ۔

Scanned with CamScanner

ع نی سیوا سیں نیناں دے آکھے لگے

ان تینوں بلند پایہ صوفیائے کرام کی کافیاں کچھ نامور مغنیوں اور مغنیاؤں نے بڑے عمدہ، دلپذیر، موثر اور اعلیٰ سلیقے سے گائیں۔ خاں صاحب استاد برکت علی خاں، علی بخش ظہور، ملکۂ کافی زاہدہ پروین، حامد علی بیلا، یہ وہ قابل صد احترام فنکار ہیں جنہوں نے شعوانہ اور عارفانہ مضامین و خیالات سے مزین کافیوں کو گائیکی سے چہار چند کر دیا۔ کافی کو اگر مخصوص اور تاثیر انگیز راگ راگنیوں میں ہنرمندانہ سلیقے سے سمو کر گایا جائے تو سچ ہے کہ مغنی، مغنیہ، موسیقار، سامع سب کو کافی کی رینی چڑھ جاتی ہے اور فضا میں ایک عجیب سی روحانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ یہی اس صنف اور موسیقی کے سنگم کا تحیر زا معجزہ ہے۔ کافی گانے والے مغنی یا مغنیہ کا گلا سُر میں ہونے کے ساتھ پُر سوز پُر گداز اور اثر انگیز ہونا نہایت ضروری ہے۔ بغیر احساسِ کرب اور لگن کے کافی کا لگاؤ بجھا بجھا سا رہتا ہے۔

یہ سوز یہ گداز ہی درحقیقت اس لگاؤ میں موجود تاثیر اور دل پذیری کا سبب ہوتا ہے۔ آواز کا سُر میں ہونے کے ساتھ ساتھ سوز و گداز سے معمور ہونا اللہ کریم کا خاص عطیہ ہوتا ہے۔

کافی کے مایہ ناز گائیک حامد علی بیلا کو اللہ نے ان تمام اوصاف سے بڑی فیاضی کے ساتھ نوازا تھا۔ جب وہ کافی گاتے تو گویا ان کے سُریلے اور پُر گداز گلے سے ماروبہاگ کے سُر چھڑ جاتے۔ خوبیدہ کیدار بیدار ہو جاتا۔ سری راگ کافی کی صورت میں روح میں اترنے لگتا۔

دوسری صدی کے دوسرے نصف میں یعنی 1950 سے 2000 تک درد انگیز سُریلے اور رسیلے گلے کے مالک حامد علی بیلا نے شاہ حسینؒ کی کافیوں کو جس عمدگی، خود سپردگی، خوبصورتی، وجدان گیان، لگن اور قلبی کیفیات کے رچاؤ سے گایا وہ صرف اور صرف حامد علی بیلا ہی کا حصہ ہے۔

راقم الحروف نے قریباً بیس برس قبل اس عظیم فنکار کا ایک انٹرویو ریکارڈ کیا تھا جس میں انہوں نے خود اپنی زندگی کے حالات اور اپنے فنی سفر کا ذکر بڑی محویت اور صداقت سے کیا تھا۔ یہاں طوالت سے احتراز کرتے ہوئے اس انٹرویو کے اقتباسات پیش نہیں کر پاؤں گا جس کے لیے اپنے معزز قارئین سے پیشگی معذرت کر رہا ہوں۔

بیلا ایک ایسے درویش منش اور فقیر صفت فنکار تھے کہ جن کے ظاہر باطن میں درویشی تھی۔ یہی سبب تھا کہ ان کی دوستی علی بخش ظہور جیسے فقیر منش گائیک سے تھی۔ اکثر ریڈیو کی کینٹین میں اکٹھے بیٹھے ہوئے دیکھا جاتا تھا۔

برس ہا برس قبل حامد علی بیلا سفید شلوار قمیض اور کئی بار سفید پینٹ شرٹ میں ملبوس دیکھے جاتے تھے مگر رفتہ رفتہ ان کے باطنی مزاج کا رنگ ان کے ظاہر میں بھی نمودار ہونے لگا اور پھر تا حیات وہ سبز چولے میں ملبوس منفرد نظر آنے لگے۔ ان کا مزاج اور باطن تو فقیرانہ اور درویش آ سا تھا ہی اب ان کا ظاہری حلیہ بھی جمالی ملنگوں جیسا ہو چکا تھا۔ اس ظاہری اٹھان میں ان کی شخصیت کا روحانی جمال چمک

Scanned with CamScanner

دمک اٹھا رہا تھا۔

اہل بیت اور پنجتن پاک سے عقیدت وارادت ان کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتی تھی۔ قتیلِ کربلا کا اسم گرامی سنتے ہی ان کی آنکھیں نم ہو جاتی تھیں۔

کون گن رسیا اور سُر شناس ایسا ہوگا کہ جو اس درویش صفت مغنی کی آواز میں موجود اثر انگیزی اور سوز و گداز کا قائل نہ ہوگا۔ چونا منڈی کٹری باوا میں اپنی رہائش کے قریب حضرت عباس علم دار کے بہت بڑے علم کے سائے میں بیٹھا کرتے تھے، وہیں ان کو میں اپنے ساتھ اپنے غریب خانے میں لے کر آیا تھا۔ وہیں ان سے طویل انٹرویو کرنے کا اعزاز حاصل ہوا تھا۔ مجھ سے بہت پیار کرنے لگے، بڑی شفقت سے پیش آتے۔

حامد علی بیلا کے آکار میں ایک محویت تھی۔ ایک دھیان گیان تھا، ایسا دھیان گیان کہ صرف درویش مغنیوں ہی کا مقدر ہوا کرتا ہے۔ گائیکی میں ایسی پختگی، ایسا کمالِ ریاضت، بھرپور سُروں سے سجا ہوا پُر گداز گلا ایسا سوز جو سنگ دلوں کو بھی موم کر دے۔

کلاسیکی نقطہ نظر سے کافی کی گائیکی کا یہ انداز انہیں بلاشبہ ایک صاحبِ اسلوب مغنی تسلیم کروالیتا ہے۔ تان پلٹے کا استعمال بالکل نہ ہونے کے برابر مگر پُر سوز گلے سے نکلنے والا ہر سُر برابر آخر تک قائم دائم۔ ساتانی شفاف آکار، موثر اور دلپذیر گائیکی ان کے گلے میں جو تاثیر جو رس جو سوز و گداز پایا جاتا تھا وہ شاہ حسینؒ کی کافیوں کے مزاج کے عین مطابق تھا۔ سو اس جذب و مستی کی یہ کرامت تھی کہ شاہ حسین کی کافیوں اور حامد علی بیلا کا تذکرہ گزشتہ نصف صدی سے لازم و ملزوم ہو کر رہ گیا۔ شاہ حسین کا اسم گرامی کانوں تک آتے ہی حامد علی بیلا کی سریلی اور پر گداز آواز کانوں میں رس تو گھولتی ہی ہے مگر ساتھ ہی دل کو تھامنا بھی پڑ جاتا ہے۔

اس درویش گائیک اور کافی کی گائیکی میں ان کے فن کا لوہا ماہرینِ موسیقی نے ہر دور میں مانا اگرچہ انہوں نے ہلکی پھلکی موسیقی کے ضمن میں لوک گیت، بولیاں پنجابی متفرق نغمات بھی گائے۔ چند اور صوفی شعرا کا عارفانہ کلام بھی گایا مگر شاہ حسین کی کافیوں کی گائیکی کے حوالے سے ان کی ایک خاص اور بڑی منفرد پہچان بن گئی۔ اس پہچان کے حوالے سے ماہرین فن اور شاہ حسین کے ارادت مندوں نے انہیں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا اور ان کا احترام کیا۔

حامد علی بیلا کے ساتھ بیلا کی توجیہہ خود انہوں نے راقم خاکسار کو اپنے انٹرویو میں بتائی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ برس ہا برس پہلے کی بات ہے کہ وہ ایک روز حضرت شاہ حسینؒ کے مزار پر حاضری کے لئے گئے ہوئے تھے وہیں انہیں ایک بڑے ہی نورانی شکل وصوت والے بزرگ ملے۔ انہوں نے حامد علی سے کہا ''تم حامد علی ہو.....؟ وہی جو کافیاں گاتا ہے؟

اس درویش منش فنکار نے اپنے غائبانہ تعارف پر تعجب کا اظہار کیا اور ان بزرگ کو وہیں بیٹھ کر شاہ حسین کی کافیاں سنائیں۔ بزرگ ان کی رسیلی، سُریلی موثر اور پُر گداز آواز سن کو گویا ہوئے ''تمہاری آواز میں تو شاہ حسین کی کافیوں میں موجود بیلے جیسا سوز و گداز

ہے، بیلے کی سی اداسی ہے۔ حامد علی تیرے تو گلے میں ہی شاہ حسین کا جنگل بیلا موجود ہے تو اپنے نام کے ساتھ بیلا لگا لے اللہ خیر کرے گا۔ لہٰذا اسی روز سے وہ حامد علی سے حامد علی بیلا بن گئے۔ حقیقتاً ان کی آواز میں جنگل بیلے جیسا ہی سوز اور اداسی تھی۔

ایک پُر پیچ غنا ایک حریری نغمہ
ہائے وہ حسن کہ جنگل کی صدا ہو جیسے

.....

فنِ موسیقی کے حوالے سے ان کا آبائی تعلق امرتسر کے ربابی خاندان سے تھا جب قریباً دو صدیاں قبل بین کار اور ربابی اپنے اپنے اسلوب و آہنگ کے باعث دو حصوں میں بٹ گئے تو دونوں ہی نے اپنے اپنے فن میں کمال دکھایا۔ ادھر لاہور جو کہ ثقافت اور فنونِ لطیفہ کا گہوارہ تھا۔ یہاں بھی ربابی اپنے فن کا کمال دکھاتے رہے۔ یوں ان کے دو تعارف اپنی اپنی شناخت بن گئے ایک امرتسری ربابی دوسرے لاہوری ربابی۔

حامد علی بیلا امرتسر کے ربابی خاندان کے چشم و چراغ تھے اور اسی شہر میں وہ ۱۹۳۰ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا محترم حسین بخش خاں موسیقی کے عامل اور عالم تھے۔ امرتسری ربابیوں میں بڑے معزز و محترم شمار ہوتے تھے۔ حامد علی بیلا کے والد محترم استاد غلام حیدر بھی درویشانہ طبعیت کے مالک تھے اور نظری اور علمی حوالے سے سُر یا کے اسرار و رموز خوب خوب جانتے تھے۔ ان کی گائیکی کا ذہنی میلان بھی کافی کی طرف تھا اور خود بھی شاہ حسین لہوری کی کافیاں مختلف راگ راگنیوں میں کمپوز کر کے گایا کرتے تھے۔ مارو بہاگ، درگا، دیس کیدار، بھیم پلاسی اور تلک کامود یہ استاد غلام حیدر خاں (ربابی امرتسری) کے پسندیدہ راگ تھے۔ حامد علی بیلا نے موسیقی کی ابتدائی تعلیم اپنے والد محترم ہی سے حاصل کی۔ بالخصوص کافی کی گائیکی کے اسرار و رموز وہ قیام پاکستان سے قبل ہی اپنے موسیقار والد محترم سے سیکھ چکے تھے۔

قیام پاکستان کے بعد امرتسر کا یہ ربابی خاندان ہجرت کر کی لاہور آن بسا اور چونا منڈی ۰ اندرون مستی دروازہ) لاہور میں کٹڑی باوا میں اپنی رہائش اختیار کر لی۔ ان کی گائیکی اور فن اور ریاضت کا سفر قیام پاکستان سے قبل ہی شروع ہو چکا تھا۔ آنے والے برسوں میں وہ لوک گیت، فلمی گیت (محدود تعداد میں) بولیاں اور متنوع پنجابی گیت گاتے رہے۔ مگر چند ہی برس بعد ان کے باطن میں کافی کا نہفتہ گائیک کھل کر سامنے آنے لگا اور پھر یوں ہوا کہ حامد علی بیلا کے گلے میں اللہ کریم نے جو سُر، جو سوز و گداز جو رس عنایت فرمایا تھا۔ انہوں نے یہ عنایات الہیٰ شاہ حسینؒ کی کافی کی گائیکی کی نذر کر دیں، گویا سرخرو ہوئے۔ اکابرین موسیقی کا کہنا ہے کہ حامد علی بیلا کو شاہ حسین کی رینی چڑھی ہے۔ ایک عظیم صوفی شاعر کی کافیوں کو (یاد رہے کہ شاہ حسین لاہوری میں صنف کافی کے موجد مبتدی اور تعارف کنندہ ہیں انہیں کافی صنف کا بلا شرکت غیرے اولیں شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔) عمدہ ترین اور بڑے ہی اعلیٰ اور اچھے انداز میں گانے کے

Scanned with CamScanner

کرم کا فیصلہ پروردگار عالم نے لوح محفوظ میں حامد علی بیلا کے حق میں لکھ دیا تھا۔

.....

عہد ماضی میں ریڈیو کے نامور اور بے مثال فنکار سلطان کھوسٹ مرحوم اور مرزا سلطان بیگ المعروف نظام دین مرحوم کی وساطت سے ۱۹۵۶ء میں حامد علی بیلا ریڈیو پاکستان لاہور سے متعارف ہوئے اور چند ہی برس میں ان کا شمار ریڈیو لاہور کے ان فنکاروں میں ہونے لگا جو اس ریڈیو کی پہچان بنے۔ ٹی وی کی نشریات (اکتوبر ۱۹۶۴ء) کے آغاز کے دنوں میں ہی حامد علی بیلا نے اپنے فن کا مظاہرہ شروع کر دیا تھا۔ مگر ریڈیو پاکستان لاہور سے ان کی طویل وابستگی وفاداری بشرط استواری کے مصداق تھی۔ مختلف راگ راگنیوں میں اگرچہ اس درویش صوفی گائیک نے (آخر میں آپ ان کی گائی ہوئی منتخب کافیوں کی فہرست بھی ملاحظہ فرما سکیں گے۔) نے شاہ حسین کی کافیاں گائیں مگر جب قریباً نصف صدی قبل انہوں نے راگ بھیم پلاسی میں شاہ حسین کی کافی اپنے مخصوص اسلوب میں اپنی سریلی، اداس، پرگداز آواز میں گائی کہ کافی کی گائیکی اور موسیقی سے محبت کرنے والے ہر سامع کے دل کے در و دیوار لرز اٹھے۔

مائے نی میں کینوں آکھاں، درد وچھوڑے دا حال
دُھواں دُھکھے میرے مرشد والا، جاں پھولاں تاں لال
سُولاں مار دیوانی کیتی، برہوں پیا خیال
دُکھاں دی روٹی، سولا ں دا سالن، آہیں دا بالن بال
جنگل بیلے پھراں میں ڈھوینڈی، اجے نہ پایو لعل
کہے حسین فقیر نمانا، ملے تاں تھیواں نہال

اس بے عدیل کافی کو بھیم پلاسی کے علاوہ راگ کیدار میں بھی کمپوز کیا گیا تھا۔

ان کی مؤثر و دلپیر دلنشین گائیکی کے فن کے اعتراف میں انہیں کئی مختلف ایوارڈز دیئے گئے اور ۱۹۹۵ء میں انہیں صدارتی تمغۂ حسن کارکردگی یعنی Pride of Performance بھی دیا گیا۔

حقیقت تو یہ ہے شاہ حسینؒ کی نظر عنایت اور ان کی گائی ہوئی فکر انگیز، دانش مندانہ پُرسوز کافیوں کی گائیکی ہی ان کے لیے سب سے بڑا ایوارڈ اور اعزاز ہے۔

۲۰۰۰ء کے آغاز میں ان کی صحت گرنا شروع ہوگئی اور ستائیس جون ۲۰۰۱ء کو شاہ حسین کی کافیوں کی اس بے مثل گائیک کی سریلی، دلگداز اور درد بھری آواز ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

سو جہان درد میں اب کیا رہا ہے　　پرندہ شاخِ دل اُڑ گیا ہے

Scanned with CamScanner

مومن پورہ قبرستان (میکلوڈ روڈ لاہور) میں آسودۂ خاک ہوئے۔

شہر خموشاں خاک تیری کھا گئی کیسے کیسے لوگ

جب تک دنیائے موسیقی میں عارفانہ کلام اور حضرت شاہ حسینؒ لاہوری کی کافیاں گائی جاتی رہیں گی تب تک اس درویش منش گائیک کا نام نامی اسم گرامی تابندہ رہے گا۔

عہد رواں کی کافی کی ایک اہم ترین اور سب سے بڑی شاعرہ نسرین انجم بھٹی مرحومہ (نثری نظم اور پابند شاعری کی صاحب اسلوب فنکارہ) نے جنازے میں شرکت کی، مگر یہ کہتے ہوئے ایک مسکت جواب دیا کہ مجھے معلوم ہے کہ خواتین تدفین میں شرکت نہیں کرتیں۔ میں قبرستان میں نہیں جاؤں گی باہر گاڑی ہی میں بیٹھ کر علامتی طور پر شرکت کرلوں گی۔ سو انہوں نے ایسا ہی کیا اور کہا کہ ''شاہ حسینا! تجھ تک تیری ایک فقیرنی، تیرا فقیر پہنچانے آئی ہے۔ شاہ حسینا اسے اپنی بکل میں کنج لے۔''

گائی گئی منتخب کافیاں

گائیک: حامد علی بیلا

نمبر شمار	بول	راگ/راگنی
۱	ربا میرے حال دا محرم توں	راگ سری
۲	چرخہ میرا رنگڑا رنگ لال	راگ کوڈی
۳	اک دن تینوں سپنا تھیسن گلیاں بابل والیاں	راگ آماروی
۴	آخر دادم بجھ وے اڑیا	راگ آساوری
۵	نی سیو اسیں نیناں دے آکھے لگے	راگ گوجری
۶	پیارے لال کیا بھروسہ دم دا	راگ دیوگندھاری
۷	دنیا تو مر جانا وقت نہ آوَنا	راگ وڈینس
۸	ایں دہائے کوئی دم یاد نہ کیتا	راگ وڈینس
۹	کوئی دم مان لے رنگ رلیاں	راگ وڈینس
۱۰	اساں بوہڑ نہ دینا آوَنا	راگ دھناسری

Scanned with CamScanner

۱۱	نی مائے ساہنوں کھیڈن دے	راگ دھناسری
۱۲	ربا میرے اوگن چت نہ دھریں	راگ دھناسری
۱۳	گھم چرخڑیا تیری کتن والی جیوے	راگ جے جے ونتی
۱۴	متراں ڈی مجمانی خاطر دال دالہو چھانی دا	راگ جے جے ونتی
۱۵	ڈیکھ نہ مینڈے اوگن ڈاہوں تیرا نام ستاری دا	راگ کافی
۱۶	وَت نہ دینا آوَنا	کہدار/بھیم پلاسی میں بھی گائی گئی
۱۷	مائے نی میں کینوں آکھاں درد وچھوڑے دا حال	راگ تلنگ
۱۸	نی تینوں رب نہ بھلے دعا فقیراں دی اے ہا	راگ بلاول
۱۹	میں وی جھوک رانجھن دی جانا نال میرے کوئی چلے	راگ بلاول
۲۰	نی مائے مینوں کھیڑیاں دی گل نہ آکھ	راگ رام کلی
۲۱	لکھی لوح قلم دی قادر نے مائے موڑ جے سکنی ہیں موڑ	

☆☆☆☆

Scanned with CamScanner

غزل

ہر جذبہ کو جناب میں تبدیل کرنا ہے
شعلے کو آفتاب میں تبدیل کرنا ہے
یہ چھوٹے چھوٹے غم کے پرندے کہاں سے آئے
ہر اشک کو عقاب میں تبدیل کرنا ہے
ہستی کے ہست و بود کا عالم ہی اور ہو
ہستی کو اس حساب میں تبدیل کرنا ہے
پانی کو پانی کرنا ہے لیکن کچھ اس طرح
ہر بحر کو حباب میں تبدیل کرنا ہے
لانا ہے انقلاب کو بیرونِ ذات بھی
خود کو بھی انقلاب میں تبدیل کرنا ہے
ہم کام کو کریں گے کم و بیش اس طرح
ہر کام کامیاب میں تبدیل کرنا ہے
جلوے تمام دور کے نزدیک لائیں گے
یوں نزد کو نقاب میں تبدیل کرنا ہے
لینا ہے یادؔ صبح کو مانندِ جام مے
ہر شام کو شراب میں تبدیل کرنا ہے

O

آیئے آپ کو تصویر دکھائیں
آیئے آپ کے کچھ ہوش اُڑائیں

آپ ناچے تو نہیں ہوں گے کبھی
آیئے آپ کو بھی ناچ نچوائیں

آپ کپڑے نہ اُتاریں ہر گز
اتنی سی بات ہے ننگے ہو جائیں

ایک درخواست ہے کہ آپ نہ ہوں خونم خوں
ویسے جس جا پہ اُٹھے کھجلی وہاں خوب کھجائیں

آپ جیسے بھی ہوں بس ہم کو نظر آتے رہیں
کوئی پردہ نہ اٹھائیں کوئی پردہ نہ گرائیں

Scanned with CamScanner

مرتضیٰ برلاس

غزل

چلے شمال کی جانب، جنوب جا نکلے
کہاں کا قصدِ سفر تھا، کہاں پہ آ نکلے
یہ گتھیاں جو ہیں، ڈالی ہوئی تو اپنی ہیں
مگر خدا کرے ان کا کہیں سرا نکلے
یہ زر پرستوں کی بستی ہے یا مریضوں کی
ہوس کے روگ میں سب لوگ مبتلا نکلے
ہمیں ستا کے اگر خوش ہیں آپ یونہی سہی
کسی طرح سے تو ارمان آپ کا نکلے
نہیں رضا، نہ سہی، حرفِ برہمی ہی سہی
کہ ہمکلامی کا کوئی تو سلسلہ نکلے
کماں پہ تیر چڑھائے جو منتظر تھے مرے
وہ اجنبی تو نہ تھے، سب ہی آشنا نکلے
جو مدعی ہے، مجھے اس کا فیصلہ منظور
سزا قبول، مگر میری کچھ خطا نکلے

غزل

تم کیا جانو، ہم سے پوچھو، ہے جو فضا میں تاریکی
تم تو لمبی تان کے سوئے، ہم نے شب بیداری کی
اُنہی پر اب بند ہوئے ہیں، صحنِ چمن کے دروازے
جن لوگوں نے اپنے لہو سے گلشن میں گلکاری کی
تجھ کو پھر بھی رحم نہ آیا، ہم جیسے مظلوموں پر
کتنی دعائیں مانگی ہم نے، کتنی آہ و زاری کی
کوئی اپنا دوش نہ مانے، اوروں پر الزام دھرے
ذمہ داری کس پر ہے حالات کی ناہمواری کی
پہلے ہم اپنوں کا رویہ صرفِ نظر کر دیتے تھے
شدّت سے احساس ہوا جب غیروں نے غمخواری کی
خواب سرا میں تم نے تو شب باشی کی، آرام کیا
آگے جو درپیش سفر ہے، اس کی کیا تیاری کی
اس کو کریدا جائے تو، شعلہ بھی بن سکتی ہے
ویسے تو وقعت ہی کیا ہے اک بجھتی چنگاری کی

Scanned with CamScanner

ناصر زیدی

غزل

شکریہ! تو نے یہاں جس حال میں رکھا مجھے
راس اب آنے لگا ہے ٹھوکریں کھانا مجھے

ہے نوازش ان کی بے جا دوسروں کے حال پر
اک نگاہِ لطف کے قابل نہیں سمجھا مجھے

گو بظاہر زندگی ہے میری بے حد مطمئن
سرگراں رکھتا ہے اکثر عشق کا سودا مجھے

قیسؔ اور فرہادؔ کے قصوں میں میرا تذکرہ
کر دیا ہے دوستوں نے کس قدر رسوا مجھے

گر نہیں تھا ربط و ضبطِ باہمی کا کچھ خیال
مُلتفِت نظروں سے پھر کیوں آپ نے دیکھا مجھے

سایہ بن کر جو ہمیشہ ساتھ رہتا تھا مرے
کر رہا ہے رفتہ رفتہ اب وہی تنہا مجھے

زندگی سے ایک ربطِ خاص ہے ناصرؔ مرا
چاہتی ہے یہ بہت دنیا کو اور دنیا مجھے

شفیق سلیمی

غزل

خواہشیں دل سے پیاریاں رہی ہیں
اک نہیں بلکہ ساریاں رہی ہیں

ہم کسی کے فراق میں نہیں تھے
یونہی اختر شماریاں رہی ہیں

باس آتی تھی دشمنی کی جن سے
حیف ان سے بھی یاریاں رہی ہیں

تیرے آنگن میں کھیلتی یہ خوشیاں
چار دن تو ہماریاں رہی ہیں

ایک دیوار چار سو کھنچی ہے
اب نہ بوہے نہ باریاں رہی ہیں

Scanned with CamScanner

نسیم سحر

غزل

صاف ہوتے ہی سائبان کی گرد
آ گری مجھ پہ آسمان کی گرد

شہر بھر کو لپیٹ لے نہ کہیں
ایک گرتے ہوئے مکان کی گرد

جا رہے ہیں ہم آسماں کی طرف
لے کے چلتے ہیں خاکدان کی گرد

مجھ سے بھی ہے کہیں بلندی پر
آسماں پر مری اڑان کی گرد

دفن ہونے لگے یقیں سارے
چار سُو جب اڑی گمان کی گرد

وقت اکثر ہی ڈال دیتا ہے
ہر حقیقت پہ داستان کی گرد

لشکری نیند میں ہیں کھوئے ہوئے
کند تیروں پہ ہے کمان کی گرد

حملہ آور ہوئی شکاری پر
جس پہ بیٹھا تھا، اُس مچان کی گرد

اُس سے ملنے کی دیر تھی کہ نسیم
چھٹ گئی ساری درمیان کی گرد

غزل

بڑھ گئی اور بھی کچھ بے سروسامانی دِل !
دل سے جس روز سے رخصت ہوئی ویرانی دل

فیصلہ ہو نہیں پاتا ہے، جو وہ سامنے آئے
حیرتِ آئنہ آگے ہے کہ حیرانی دِل!

آ کے کیوں بیٹھ گئی آنکھوں میں ساون کی جھڑی
ختم کیوں ہوتا نہیں موسمِ بارانی دِل؟

یہ بھی خوش فہمی تھی، سو اِس کا نتیجہ معلوم!
رونقِ ہجر سے کب کم ہوئی ویرانی دِل!

چھن گئی سلطنتِ عشق تو دِل کی کب سے
پھر بھی اُترا ہے کہاں نشۂ خاقانی دِل !

خودکشی پر اُسے آمادہ کیا آخرِ کار
ہم سے برداشت نہ ہوتی تھی پریشانی دِل

صرف اِک شخص کے جانے سے یہ عالم ہے کہ اب
نوحہ خوانی سے مشابہ ہے غزل خوانی دِل

لوٹ کر آ بھی نہیں سکتی وہ رونق اِس میں
اور دیکھی بھی نہیں جاتی یہ ویرانی دل!

عشق کے کارِ مسلسل کے تقاضے اتنے
اور اِس سمت یہ کمبخت تن آسانی دِل

یہ جو آنکھوں کو گزرگاہ بنائے ہوئے ہے
ہم کو لے ڈوبے گی اِک دِن یہی طغیانی دِل

اِک ذرا یار کا پیغام تو آ جائے نسیم
دیکھنا پھر ذرا اندازِ گل افشانی دِل !

Scanned with CamScanner

غزل

ہے کیسا سانحہ ہر سمت وحشت رقص کرتی ہے
محبت چھپتی پھرتی ہے عداوت رقص کرتی ہے

حصارِ ضبط میں جذبے مقید کر دیئے جائیں
تو لہجوں میں عجب سی اک خجالت رقص کرتی ہے

مسلسل جبر سہہ کر زیست جب اک بوجھ بن جائے
تحمل ہار جاتا ہے بغاوت رقص کرتی ہے

تکبر کی قبا پہنے سجل جذبوں کی لاشوں پر
ہمیشہ اطلس و ریشم میں دولت رقص کرتی ہے

گر اہلِ دل سے دکھ پہنچے کسی کو بھی کبھی اختر
تو اس کے دل میں ہر پل اک ندامت رقص کرتی ہے

اختر کاظمی

غزل

داستاں کیا ہو بیاں اشکوں کی
کون سنتا ہے فغاں اشکوں کی

وقت کے جبر کی زنجیروں کو
کیسے کاٹے گی سناں اشکوں کی

سسکیاں کس کو ہوں محسوس بھلا
بند آنکھوں میں نہاں اشکوں کی

رنج اپنوں نے دیئے ہیں اتنے
بن گئی زیست دکاں اشکوں کی

کیا کہیں ہے کوئی ایسا گوشہ
قدر کوئی ہو جہاں اشکوں کی

بے حسی میں جہاں راحت ہو وہاں
کیا ہے اوقات رواں اشکوں کی

بے اثر جب ہیں صدائیں اختر
کون سمجھے گا زباں اشکوں کی

Scanned with CamScanner

اکرم ناصر

غزل

مقتل سجا کے آئے ہو, طالب اماں کے ہو
ہوتا ہے یہ تماشا وہاں بھی , جہاں کے ہو

کیا کام ہے گلی میں مرے , کس سے ملنا ہے
پوچھا نہیں کہ کون ہو صاحب , کہاں کے ہو

ہم کو زمیں کا باسی نہیں مانتے ہو اور
خود کو سمجھ رہے ہو کسی آسماں کے ہو

صورت نکل بھی سکتی ہے تم سے نباہ کی
دل کے برے نہیں ہو اگر چہ زباں کے ہو

معلوم ہونا چاہیئے تھا کچھ اتا پتہ
یہ پوچھنا تھا گل ہو تو کس گلستاں کے ہو

ہاں اس معاملے میں اب اکرم ذرا لچک
قائل اگر چہ تم بڑے سود و زیاں کے ہو

☆☆☆☆☆

اکرم ناصر

غزل

وقت کی راسیں کھینچ کے ہم نے وقت گزارا تھا
یہ اس وقت کا قصہ ہے جب وقت ہمارا تھا

سود کے ساتھ ادا کرتے ہیں جب بھی کرتے ہیں
تم کو یاد ہے کل بھی ہم نے قرض اتارا تھا

میں نے آج بھی اس لاٹھی سے سانپ ہی مارنا ہے
میں نے کل بھی اس لاٹھی سے سانپ ہی مارا تھا

اتنا بھی نہیں سوچا تم نے ڈوب گیا تو پھر
سچ بتلاؤ جھیل میں کس نے چاند اتارا تھا

وہ بھی دن تھے جب سارے مل جل کے رہتے تھے
سب کی ملکیت میں گھر سارے کا سارا تھا

آگ اور خون کی ہولی کھیلی کس کے کہنے پر
کون تھا اس تخریب پہ جس نے انہیں ابھارا تھا

کس نے یہ انہونی ہونی کر دی تھی اکرم
کس نے سوئی کے ناکے سے اونٹ گزارا تھا

Scanned with CamScanner

غزل

جب سے پہچان میں نہیں ہوں میں
گھر کے دالان میں نہیں ہوں میں

ہاتھ سے چیز چھوٹ جاتی ہے
اپنے اوسان میں نہیں ہوں میں

پھول کملا گیا تھا ، پھینک دیا
اپنے گلدان میں نہیں ہوں میں

ایک سجدے میں ہو چکی تحلیل
شب کے وجدان میں نہیں ہوں میں

جسم کو کون گھر میں رکھتا ہے
جسم ہوں جان میں نہیں ہوں میں

میں نے خود بھی بھلا دیا خود کو
اب کسی دھیان میں نہیں ہوں میں

خود ہی مقتول خود ہی قاتل ہوں
اپنے تاوان میں نہیں ہوں میں

آرزو سے نکل کے دیکھ مجھے
عہد و پیمان میں نہیں ہوں میں

زندگی اب گھڑی کی ٹِک ٹِک ہے
دل کے استھان میں نہیں ہوں میں

جو ضروری تھا وہ سنبھالا ہے
اپنے سامان میں نہیں ہوں میں

مجھ کو وحشت قبول کر لے گی
اب گریبان میں نہیں ہوں میں

زندگی سے گذر رہی ہوں سحر
کسی طوفان میں نہیں ہوں میں

☆—☆☆☆☆☆—☆

Scanned with CamScanner

عارف ضیاء

غزل

چاندنی طاق پر رکھی ہوئی ہے
اس لئے آج روشنی ہوئی ہے

آؤ اس گھر سے پوچھ لیتے ہیں
اس کی دیوار کیوں گری ہوئی ہے

چھوڑ آیا ہے وہ زباں گھر پر
یوں ذرا آج خامشی ہوئی ہے

بات کیا پوچھنی تیرے دل کی
تیرے چہرے پہ یہ لکھی ہوئی ہے

جیسے رک جائے سانس بعد از مرگ
زندگی اس طرح رُکی ہوئی ہے

جان لے گی زبان کی خنجر
زہر قاتل میں یہ بجھی ہوئی ہے

عارف ضیاء

غزل

کشادہ اپنے اندر ہو گیا ہوں
میں دریا تھا سمندر ہو گیا ہوں

تیری آنکھوں سے گر کر جھیل میں اب
تری نظروں کا منظر ہو گیا ہوں

کوئی آیات پڑھ کر مجھ پہ پھونکے
کسی جادو سے پتھر ہو گیا ہوں

سبب ہر گز نہیں ہے خشک سالی
میں اب پانی سے بنجر ہو گیا ہوں

سرِ راہ ٹھوکریں اتنی لگی ہیں
کہ میں پتھر سے کنکر ہو گیا ہوں

خسارا ہجر کا ایسا ہوا ہے
میں اب بد سے بھی بدتر ہو گیا ہوں

Scanned with CamScanner

ظہور احمد

شکار کوئی نہیں ہے مچان باقی ہے
زمان گذر گیا ہے، مکان باقی ہے

ہماری غزلِ مسلسل کو کون پوچھتا ہے
کوئی خرید نہیں ہے دکان باقی ہے

تمھارے عشق میں نقصان آدھا آدھا ہے
کہ مال سارا گیا اور جان باقی ہے

ہمارے اُس کے تعلق میں اک تعطل ہے
ابھی تک اس کے لیے یہ گمان باقی ہے

یہاں پہ لوگ نکلتے نہیں رہے اکثر
جہاں پہ نکلے وہاں اردگان باقی ہے

اسلام آباد، ستمبر 2017

(سعد اقبال باجوہ کیلئے)

رکھتے ہیں یاد ہم کو مگر لوٹتے نہیں
احباب کر گئے ہیں سفر لوٹتے نہیں

جاتے ہیں سمتِ دشتِ غریبی مسافراں
ایسے کہ پھر سے اپنے شہر لوٹتے نہیں

میں نے تو آپشن یہ دیا تھا کہ لوٹ جا
اُس نے کہا کہ بیچ سفر لوٹتے نہیں

اب تو یہ جانتے ہیں سبھی کہ ظہور ہم
جاتے ہیں اُس گلی میں مگر لوٹتے نہیں

اسلام آباد، اگست 2016

Scanned with CamScanner

سید اظہر فرید

غزل

ایسے جھنجھٹ کو کہاں تک بھلا پالے کوئی
کب تلک سنتا پھرے تیرے یہ نالے کوئی

وحشتیں رقص کناں درد میں ڈوبی ہے صدا
ان اندھیروں کو کسی طور اجالے کوئی

میں تو امید کی چادر ہی لیے پھرتا ہوں
آ گئی سر پہ قضا اس کو تو ٹالے کوئی

میں ہوں گردابِ معیشت میں سراسر الجھا
اجنبی لہر ہی اس تہہ سے اچھالے کوئی

یہ محبت تو مرے بس کی نہیں ہے اظہر
مجھ سے تو ہو نہ سکا اور نبھالے کوئی

سید اظہر فرید

غزل

وہ جو مجھ سے مری پہچان طلب کرتے ہیں
آپ اپنا ہی وہ نقصان عجب کرتے ہیں

رہبروں کو ہو مبارک یہ ہنر بھی ان کا
جو بھی کرتے ہیں وہ بس اپنے سبب کرتے ہیں

کیا خبر مجھ کو کہاں شام بسر ہوتی ہے
یہ مسافر تو سرِ شام غضب کرتے ہیں

وہ تسلی بھری محفل میں دیئے جاتے ہیں
ہمیں معلوم ہے وہ کتنا ادب کرتے ہیں

گو نمائش تو لگانا ہے ہمیں بھی اظہر
کھلی وحشت میں بھی ہم جشنِ طرب کرتے ہیں

Scanned with CamScanner

ارشد چہال

رکھ رہے تھے ہر قدم حالات کی تلوار پر
عہدِ عیسیٰ قریب آتا ہے

چل رہے تھے ہم سفر پھر بھی اسی رفتار پر
پھر وہ طوقِ صلیب آتا ہے

اک ردائے ابر میں سب چاند تارے چھپ گئے
شام ڈھلتے ہی اس کی آنکھوں میں

میں نے آنکھوں کے دیے ہی رکھ دیئے دیوار پر
ایک لمحہ عجیب آتا ہے

ان بڑے لوگوں کے ہاتھوں میں صفائی خوب ہے
درد روتا ہے لگ کے سینے سے

خون کے دھبے نظر آتے نہیں کردار پر
جب بھی ملنے طبیب آتا ہے

دھیرے دھیرے کر دیا شاخوں کو اس نے بے ثمر
ناخدا سے شکائتیں کیسی

کس نے یہ آکاس بیلیں ڈال دیں اشجار پر
اب تو ساحل قریب آتا ہے

اس کا نوکر آج اک پھولوں کا تحفہ دے گیا
عشق ایسا بھی سازگار نہیں

رحم آخر کچھ تو اس کو آگیا بیمار پر
ایک نہ اک رقیب آتا ہے

زندگی بھر شعر جس کے سن کے ٹھکرائے گئے
زندگی بھر خطائیں کرتے ہیں

اس کو تمغے مل رہے ہیں اب انہی اشعار پر
آخر اک دن حسیب آتا ہے

اک زمانہ تھا کہ ہم پڑھتے رہے دل کی کتاب
چاہے جس شہر میں رہیں ارشدؔ

گرد کتنی جم چکی ہے اب اسی شہکار پر
ساتھ اپنا نصیب آتا ہے

Scanned with CamScanner

رفعت زہرا زیدی

غزل

ستم ہزار سہے پر کبھی گلہ نہ ہوا
تمہارے ساتھ محبت کا سلسلہ نہ ہوا
سجی بنی تھی کبھی خوب بزمِ یاراں بھی
اور اب یہ حال کہ تم سے ملے زمانہ ہوا
تم آئے بیٹھے رہے محو گفتگو لیکن
جو عرض کرنا تھا پورا وہ مدعا نہ ہوا
کہا تمہی نے تھا راہیں جدا ہیں تم سے میری
مجھے کبھی بھی یہ کہنے کا حوصلہ نہ ہوا
نہ جانے کتنے مہ و سال یوں گزرتے رہے
کہ دردِ دل میرا منت کشِ دوا نہ ہوا
یہ عشق بھی تو عجب روگ ہے میرے ہمدم
جو دل کو لگ گیا اک بار پھر جدا نہ ہوا
ہوا ہے جب سے وطیرہ ہمارا سچائی
کوئی بھی شخص کبھی اپنا ہمنوا نہ ہوا
نکل کے یاد کے آسیب سے کبھی رفعتؔ
دل تباہ کسی پل بھی خوشنما نہ ہوا

غزل

جیسے جیسے وقت گزرنے لگتا ہے
روپ انساں کا اور بھی گھٹنے لگتا ہے
جب بھی دل کی بات کروں میں اس سے تو
تیزی سے وہ بات بدلنے لگتا ہے
بن کے من کا میت یہ انساں دیکھو تو
کیسے کیسے رنگ بدلنے لگتا ہے
دولت کا نشہ بھی کیا نشہ ہے
اچھا خاصا شخص بہکنے لگتا ہے
ساتھی ساتھ اگر نہ دیں تو ایسے میں
دشمن بھی کچھ اپنا لگنے لگتا ہے
اچھے دن بھی آتے ہیں لیکن افسوس
عمر کا سورج جب کہ ڈھلنے لگتا ہے
درد کے ہاتھوں رفعتؔ انساں بعض اوقات
اپنے سائے سے بھی ڈرنے لگتا ہے

Scanned with CamScanner

غزل

ہم نے کہیں یہ بات کوئی کی، کہ دِل جلے
کرتے ہیں بات آپ ہی ایسی، کہ دِل جلے

اس درجہ بے رُخی کا سبب ہے کوئی مگر
پوچھیں گے کچھ نہ آپ سے ہم بھی، کہ دِل جلے

اُس بے وفا کے خواب سے بہتر تھا رتجگا
اچھا ہوا جو نیند نہ آئی، کہ دِل جلے

اے عُمر آئینہ بھی تو محورِ عکس ہے
من دیکھ اِس میں شکل ہی اپنی، کہ دِل جلے

ہر بار دِل جلا کے مرا خوش ہوئے تھے وہ
ہم نے بھی آج اُن سے وہی کی، کہ دِل جلے

ہم کشتہ جفائے صنم ہیں، یہ ٹھیک ہے
کیوں سوچتے ہیں بات ہی اُن کی، کہ دِل جلے

بے گانگی سے پوچھ لیا ! ٹھیک ہو حریمؔ ؟
یوں خیریت جناب نے پوچھی، کہ دِل جلے

ارسلان راٹھور

غزل

آنکھ میں صحراؤں کا مینہ لیے پھرتا تھا میں
کم سوادوں کی نظر میں ریت کا دریا تھا میں

روز کتنے تاکتا اوندھے پڑے سات آئینے
آٹھویں شب غار سے باہر نکل آیا تھا میں

رات ناگن کی طرح اتری تھی روشن دان سے
خوف ایسا تھا کہ دیواروں سے جا لپٹا تھا میں

ناتراشیدہ مری کشتی دھری تھی پیڑ میں
ریت کے نیچے ابھی سویا ہوا دریا تھا میں

دھوپ بجروں میں بھری تھی اور آنکھوں میں شفق
آب گوں نیلاہٹوں میں ابر کا ٹکڑا تھا میں

پھر سفر کرنا پڑا کوہِ ندا سے اس طرف
گرتے پڑتے شامیوں کا آخری پتا تھا میں

Scanned with CamScanner

قائم نقوی

غزل

جو مکمل ہے ادھوری نہیں ہونے والی
بات کوئی بھی تو پوری نہیں ہونے والی

روبرو اس کے جہاں بھر کی ہر اک بات چلے
ہے جو اک بات ضروری نہیں ہونے والی

لوٹ جاتے ہیں لئے وعدۂ فردا کا فریب
جانتے ہیں کہ حضوری نہیں ہونے والی

زندہ رہنے کو بناتے ہیں بہانے کیا کیا
ہاں مگر موت سے دوری نہیں ہونے والی

دل تو اس بات پہ پکا ہے عقیدے کے بغیر
آگ ناری کبھی نوری نہیں ہونے والی

غزل

آن دیکھے جذبوں کو کیا تحریر کریں
پانی پر ہم گھر کیسے تعمیر کریں

ناممکن بھی ممکن میں ڈھل جائے گا
آتے جاتے لمحوں کو زنجیر کریں

نفرت چھوڑ کے پیار بسائیں آنکھوں میں
دھڑکن دھڑکن دل دنیا تسخیر کریں

صلح کے پیغام میں کوئی چال نہ ہو
آؤ فصیل شہر کو پھر تعمیر کریں

اب تو سچ بھی جھوٹ کا پرتو لگتا ہے
پھر سے قائم ہم رسم شبیر کریں

Scanned with CamScanner

کبوتر

محمود احمد قاضی

ایک روایت ہے کہ اس گھر کو میرے پردادا نے ایک ہندو سے تین سو ستر روپے میں خریدا۔ اس وقت اس کی ہیئت ایک گودام جیسی تھی۔ گولائی میں بنے تین بڑے کمرے، ان کے ماتھے پر چکر کھاتا ہوا برآمدہ، سامنے کھلا صحن۔ ڈیوڑھی کے ساتھ بیٹھک، گلی میں بیرونی دیوار کے ساتھ بھینس یا گائے کے لیے ایک ناقہ بنی تھی۔ پردادا کے اس دنیا کے منظر سے ہٹ جانے پر اس میں پہلی جو تبدیلی کی گئی وہ تھی ایک مزید کمرے کی تعمیر۔ یہ دادا کی مطالعہ گاہ بنی۔ وہاں وہ دوستوں کے ساتھ محفل جماتے رہے۔ ان کی ہنسی، قہقہہ، سارے گھر کے اندر چکر اتا رتا۔ تب دادی منہ سے اونہہ کی آواز نکالتی۔ یہ بندہ ہنس رہا ہو یا رو رہا ہو اس کی آواز کبھی نیچی نہیں ہوتی۔ اس ہلکی پھلکی سرزنش کے باوجود دادا نے اپنی روش نہ بدلی۔ ان کے جانے کے بعد گھر میں ہر وقت لہراتی حقے کی گڑگڑ بند ہوئی اور اُپلے آنے بھی موقوف ہوئے۔ ابا نے گھر میں خاطر خواہ تبدیلیاں کر ڈالیں۔ انہوں نے دو بڑے کمروں کو باقاعدہ بیڈروم میں بدلا بلکہ تیسرے کی گنجائش بھی پیدا کی۔ یہ کمرہ البتہ مہمان خانہ کہلایا۔ کوٹھے پر مٹی کے اضافے کے ساتھ ایک برساتی کی تعمیر بھی ہوئی۔ اسی برساتی میں ایک چھتن بھی بنی۔ لکڑی سے بنی ٹیرس نما جگہ تک پہنچنے کے لئے ایک دیوار کے ساتھ سیڑھی رکھی گئی۔ جس پر چڑھ کر ضرورت کے وقت اس کو استعمال میں لایا جا سکتا تھا۔ ابا کے بعد میں نے یہاں سے کاٹھ کباڑ ہٹا دیا اور اسے اپنے مصرف میں اس طرح لایا کہ یہاں میرے زیر مطالعہ رہنے والے ادبی اور سیاسی رسالے اور پرانے اخبار پڑے رہتے تھے۔ میں کبھی کبھار ہی دوبارہ ادھر رجوع کرتا تھا وہ بھی اس وقت جب کسی ریفرنس کے لئے مجھے کوئی چیز ڈھونڈنی تھی۔

ابا اماں کے جانے کے بعد میں، میری بیوی اور بیٹا بیٹی اس گھر میں رہنے لگے۔ بیٹی کی شادی کے بعد ہم تین بندے، میاں، بیوی اور بیٹا رہ گئے۔ میں ایک مقامی سکول میں طویل مدت مدرسی کرنے کے بعد اب گھر پر آرام کرتا تھا۔ بیوی کی ملازمت کے چونکہ ایک دو سال باقی تھے، اس لئے وہ ابھی اپنے سکول میں ہیڈ مسٹریسی نبھا رہی تھی۔ اٹھارہ سال کا بیٹا ایف ایس سی پری انجینئرنگ کا امتحان دے کر فارغ تھا۔ نتیجے کے انتظار سے پہلے وہ یو ای ٹی کے انٹری ٹسٹ کو پاس کر چکا تھا۔ میرے ہوتے ہوئے بھی گھر میں کچھ تبدیلیاں

رونما ہوئیں۔ کچن جو پہلے تنگ تھا اب کشادہ ہوا۔ ایک واش روم کے بجائے تین ہو گئے۔ مطالعے کے کمرے میں اب کتابوں کے انبار تھے۔ سب کچھ بدلا لیکن ایک روایت اب بھی برقرار تھی۔ پردادا سے لے کر سب مردوں کی ایک عادت تھی کہ وہ رات کو سونے سے پہلے گرما گرم دودھ پیتے اور ساتھ میں آدھی چھٹانک کے قریب گلقند ضرور استعمال کرتے۔ میں بھی یہ کر رہا تھا لیکن میرا بیٹا ان دونوں چیزوں کے نزدیک بھی نہیں پھٹکتا تھا۔

وہ لا اُبالی سا بندہ تھا، وہ ہر وقت آسمانوں میں کچھ ڈھونڈتا دکھائی دیتا۔ وہ سفید پاجامہ قمیض پہنتا اور پاؤں میں زیادہ تر چپل اڑسے رکھتا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں ایک طرح کا حزن و اداسی تھی۔ میں نے کئی بار اس کے حلیے، رویے اور برتاؤ کے بارے میں اس سے بات کرنے کی کوشش کی۔ وہ ہر بار ٹال جاتا۔ وہ مجھے بالکل بھی وقت دینے کے لئے تیار نہ تھا۔ میرے اور اس کے درمیان ایک اَن دیکھی خلیج حائل تھی۔ وہ ذہین تھا بلکہ فطین تھا۔ ریاضی اس کا پسندیدہ مضمون تھا۔ وہ اشکال بازی میں منفرد حیثیت کا حامل تھا۔ احاطوں، مکانوں اور مختلف قسم کی پیچیدہ اور آسان شکلوں والی عمارتوں کے اسکیچ وہ یوں چٹکیوں میں بنا لیتا تھا۔

تھوڑا عرصہ پہلے اس میں ایک تبدیلی رونما ہوئی۔ اس نے اوپر برساتی میں ڈیرہ جما لیا۔ میری پریشانی کچھ بڑھی، میں نے اس سے بات کی۔

تم اوپر کیوں آ گئے؟

تم تنہائی پسند کیوں ہوتے جا رہے ہو؟

اپنی ماں سے اور خود مجھ سے تمہارا مکالمہ نہ ہونے کے برابر کیوں ہے؟

کیا تمہیں کسی لڑکی سے محبت ہو گئی ہے؟

تمہارے سامنے کوئی ایسی رکاوٹ تو نہیں جسے تم اکیلے عبور نہیں کر پا رہے؟

یوں گم سم نہ رہو۔ میری بات کا جواب دو۔

اس نے جواب نہیں دیا۔ وہ یوں ہی رہا۔

نئی بات یہ ہوئی کہ برساتی سے غٹرغوں کی آوازیں آنے لگیں، میں اوپر گیا۔ برساتی کی دیوار کے ساتھ کبوتروں کی چھتری نصب تھی، وہاں چند کبوتر بیٹھے تھے۔ یہ تھے تو مختلف نسلوں کے لیکن ایک بات ان میں مشترک تھی کہ وہ سب کے سب سفید پروں کے مالک تھے۔ اُجلے براق پروں والے، میں نے چند ایک کو چھتن کے اوپر بھی ٹہلتے پایا۔ رسالوں اور اخباروں کے بعد جو جگہ بچی تھی وہاں انہوں نے بسیرا کر رکھا تھا۔ میرے حساب سے کل ملا کے یہ بیس عدد ضرور تھے۔

میں نے سبب پوچھا۔ اس نے جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔

Scanned with CamScanner

میں نے لہجے میں سختی اختیار کرتے ہوئے کہا:

مگر یہ کبوتر؟

جواب ملا۔

ہاں، یہ کبوتر!

عرصے کے بعد مجھے اپنے کسی سوال کا جواب تو مل گیا تھا مگر وہ بھی ادھورا تھا۔ میں اس کے اس ادھورے جملے کے مفہوم سے ناواقف رہا۔ وہ اپنے مشغلے میں لگا رہا۔ کبوتروں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوا۔ اب وہ یہاں وہاں سارے گھر میں اڑتے پھرتے تھے۔ جب ضرورت ہوتی وہ ان کے پر کاٹتا رہتا۔ وہ ان پروں کو ایک تھیلے میں ڈالتا جاتا۔

پوچھا:

ایسا کیوں کرتے ہو؟

یونہی!

یہ مختصر اور نامکمل جواب مجھے اس سے مزید سوالات کرنے پر اکساتا تھا لیکن وہ توجہ ہی نہیں دیتا تھا۔ اِدھر سے اُدھر حرکت کرتا، چھلاوہ بنا رہتا۔ ہم میاں بیوی بہت پریشان رہنے لگے۔ میں نے ایک نفسیات کے ماہر رشتے دار سے بات کی۔ اس نے کہا، اس کے ذہن میں کہیں کوئی گرہ لگ گئی ہے، وہ کھلے تو بات بنے۔

میں نے کہا:

مداوا کیسے ہوسکتا ہے؟

اس نے کہا:

اس کے لئے چند سیشن اس کے ساتھ کرنے پڑیں گے۔

میں نے جواباً کہا:

کرلو۔

تگ و دَو شروع ہوئی۔ اس نے مان کر نہ دیا بلکہ دن بدن تلخ ہوتا گیا۔ ہم لوگوں نے اس کے کام میں مداخلت بند کردی۔ وہ پُرسکون ہوگیا۔ ہر وقت کوٹھے پر چڑھا رہتا۔ وہ اور کبوتر تھے، کئی بار تو لگتا وہ ان ہی کی طرح بڑبڑا رہا ہے، ان سے باتیں کررہا ہے۔

اوئے کلے تم اپنے آپ سے بے خبر کیوں رہنے لگے ہو؟ اپنی کیئر کرو بھائی۔

اور تم، تم نے کیا بھیس بدلا ہوا ہے۔ کیا یوں گردن اکڑا کر چلنے سے تم خود کو منفرد اور معزز ثابت کرنے کی کوشش کررہے ہو۔

Scanned with CamScanner

کبوتروں کے ساتھ اس کا یہ مکالمہ بھی میری سمجھ سے باہر تھا۔ میں سوچتا میری طرف سے اس کی تربیت میں کیا خامی رہ گئی ہے۔ کیا اس کی وجہ بچپن کا زیادہ لاڈ پیار، کبھی کبھار کی مار، جھڑکیاں یا وقفوں پر مبنی میری لاتعلقی تو نہیں۔ وہ دو تین سال پہلے تک ماں کے ساتھ ہی ایک پلنگ پر سونے پر بضد تھا۔ ماں اسے پرے کرتی، اب تم بڑے ہو گئے ہو، جوان ہو، تمہیں میرے ساتھ سوتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ ویسے بھی پلنگ تمہاری وجہ سے تنگ پڑ جاتا ہے۔ کیا اس کے اس سمجھ میں نہ آنے والے رویے کی وجہ ماں کی وہ آخری جھڑکی تو نہیں جب اس نے اسے اپنے ساتھ مزید سلانے سے انکار کر دیا تھا۔ میں گڑگڑا رہا تھا۔ وہ اپنے شغل میں مگن تھا۔

ایک صبح کو وہ میرے سامنے ایک عجیب ششدر کر دینے والے حلیئے میں آیا۔ اس نے کبوتروں کے بے شمار کٹے ہوئے پر کسی کیمیکل سے اپنے پورے جسم پر یوں چپکا لئے تھے کہ وہ خود بھی ایک بڑے سائز کا کبوتر لگ رہا تھا۔ اس کا سر، گردن، پورا جسم سفید کبوتر ہو رہا تھا۔ میں اور اس کی ماں یہ منظر دیکھ کر دہشت زدہ ہو گئے۔ میں نے اپنے اندر کے کھوکھلے پن کا سہارا لیتے ہوئے پوچھا:

برساتی کی چھت پر یہ کیا کر رہے ہو تم؟

اس نے تتلاتے ہوئے کہا:

ابا، میں کبوتر!

اس کی ماں رونے لگی۔

میں نے اسے پچکارا، نیچے آنے کو کہا۔

وہ ہنسنے لگا۔

چند پڑوسیوں نے اپنے سر دیواروں سے اوپر کئے۔ وہ اس کو ایک شغل سمجھ کر انجوائے کرنے لگے۔

وہ زور سے چیخا۔

پھر اس نے اپنے بازو کسی محو پرواز کبوتر کی طرح پھیلا دیے۔

☆☆☆☆

Scanned with CamScanner

انّا کی جنگ

شمع خالد

صوفے سے اچھل کر صوفیہ کھڑی ہوگئی اور ڈاکٹر عثمان سے کہنے لگی۔ڈاکٹر صاحب مجھے آپ کو visit کرتے ہوئے دو سال ہو گئے ہیں۔آج تھوڑی سی تبدیلی کر لیتے ہیں۔آپ میری جگہ پر آ جایئے اور آج میں آپ کی کرسی پر بیٹھ جاتی ہوں۔ویسے بھی آپ کی نفسیات میں اس طرح کے ڈرامہ کرنے کو علاج کا حصہ کہا جاتا ہے۔

عثمان نے نہ سمجھتے ہوئے اپنی کرسی چھوڑ کر کاؤچ پر آ کر بیٹھ گیا۔صوفیہ نفسیات دان کی میز کرسی پر آ کر بیٹھ جاتی ہے۔پہلے تو ڈاکٹر صاحب اپنے دماغ کے بارے میں بتایئے۔کیا آپ کو اپنے ذہن کے ہر گوشے ہر cell کو خود جانتے ہیں۔نہیں ناں تو پھر میرے ذہن کو ابھی تک کیسے سمجھ سکتے ہیں۔دو سالوں میں چند گھنٹے صرف اندازے لگانے کے لئے کافی ہیں کیا؟ مجھے کبھی کبھی لگتا ہے کہ Scieuccatology والے سچ کہتے ہیں۔نفسیات ہے کیا کسی کو نشے پر لگا دینا یا دماغ کو بجلی کے جھٹکے لگانے کے علاوہ آپ کو آتا ہی کیا ہے۔خدا کے لئے فرائیڈ، ایڈیسن، ژنگ کی فرسودہ تھیوریوں سے کب نکلیں گے۔

ڈاکٹر عثمان اس خوبصورت، ذہین اور پڑھی لکھی لڑکی سے متاثر ہو رہے تھے اور کہنے لگے۔صوفیہ تمہاری باتوں سے لگتا ہے تم بہت پڑھتی ہو، اتنی چھوٹی عمر میں یہ تجربہ سارے جہان کی معلومات، واقعی تم صحیح کہتی ہو۔ہم نفسیات دان بھی انسان ہوتے ہیں، جو پڑھتے ہیں جو تھیوریز ہمارے پیش رو چھوڑ گئے ہیں انہیں پڑھ کر آگے چلتے ہیں۔

صوفیہ آپ آگے ہی تو نہیں چلتے صرف ان کے قدموں کے نشانات ڈھونڈ رہے ہیں۔اب فرائیڈ نے سیکس کو موضوع بنایا تو آپ نے نفسیات کی Termnology کو بھی ویسے ہی رکھا۔آپ کے سامنے بڑے بڑے شاعر افسانہ نگار فلسفی ہیں۔وہاں سے کسی رویہ کا نام کیوں نہیں لیتے۔

ڈاکٹر عثمان نے ہنستے ہوئے کہا: ہاں ہاں ہم نے شیکسپیئر کے ڈراموں سے بھی رویوں کے نام لیے ہیں۔یونانی کہانیوں سے بھی مثلاً ایڈی پس کمپلیکس..... مجھے اسی پر اعتراض ہے۔آپ لوگ کہتے ہیں ہر بیٹی اپنے باپ سے محبت کرتی ہے جبکہ مجھے اپنے باپ سے

Scanned with CamScanner

نفرت ہے۔

عثمان چونک کر سیدھا بیٹھ گیا۔ دو سال کی محنت کے بعد اس لڑکی نے اپنے اندر جھانکنے کے لیے روزن دیا تھا۔ میرے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ اب میں اس کے اگلے انکشاف کے لیے سرتاپا گوش تھا۔

وہ کہہ رہی تھی..... مانا وہ بہت زیادہ ذہین تھے، ان کا Vision بہت زیادہ تھا۔ پر اب ان کے بعد آنے والے بھی کم تو نہیں۔ ہم آج کی بجائے ہمیشہ ماضی میں کیوں جھانکتے ہیں۔ شعور کی بجائے لاشعور کی گتھیاں سلجھانے کی بجائے ان حقائق کا جائزہ کیوں نہیں لیتے۔ جو انسان کو نارمل نہیں رہنے دیتیں۔ سیدھے سادے طریقے سے آپ ان سوچوں، ان خوابوں کو تمثیل بنانے کی بجائے حقیقت قریب میں کیوں نہیں دیکھتے۔ Stress اور Anxiety صرف چھپے ہوئے لاشعور کی وجہ سے نہیں شعور میں موجود دکھ بھی رولا دیتے ہیں۔ G.T.B صرف حل نہیں نکال سکتے۔ Aron Back پنسلوانیا یونیورسٹی کے پروفیسر سے آپ ملے ہیں۔ وہ ہر چیز کو Horse Shiper نہیں لیتے۔ 1966ء میں ہی ڈیپریشن کہا، وہ کہتے ہیں کہ میرے مریضوں کو G.T.B سے کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ وہ کہتے ہیں کہ لوگوں کے زخمی ذہن کو اپنی انگلیوں اپنی آنکھوں سے مرہم لگاؤ، بجلی سے نہیں۔ وہ تو یہاں تک کہتے ہیں ادب، صوفی ازم کو استعمال میں لانا چاہیے۔

ڈاکٹر عثمان نے ہنستے ہوئے کہا: مجھے لگتا ہے میں آپ کا Subject بن چکا ہوں۔ مجھے آپ سے رہبری لینی چاہیئے۔

ٹھیک ہے نا..... صوفیہ کے چہرے پر پہلی بار دھیمی سی مسکراہٹ آئی۔

اب ہم اس موضوع پر اکثر بات کریں گے۔ مگر اپنے بارے میں بھی تو بات کریں۔ ڈاکٹر عثمان نے پوچھا۔

صوفیہ کہنے لگی۔ آپ نے جنگ و جدل پر بہت سی فلمیں دیکھی ہوں گی۔ تلوار کے زمانے کی بھی، ٹینک اور جہاز کے زمانے کی بھی۔ لوگوں کی باتیں ہوتی ہیں، انسانوں کا نقصان آلات کے بے دریغ استعمال..... لیکن کبھی اس زمین کی بات نہیں کی جاتی جسے کبھی تلوار کے خون سے رنگ دیا جاتا ہے، کبھی ٹینک کے گولے اس زمین کو اپنے بھاری پن سے بانجھ کر دیتے ہیں۔ خون اس کی جڑوں میں جا کر سبزے کو بھی خون آلود کر دیتا ہے۔ اسی زمین پر کبھی محبت نہیں پھلتی پھولتی۔ صرف نفرت انتقام ہی پھلتا پھولتا ہے۔

ارے میڈم! میں نے آپ کے بارے میں پوچھا ہے اور آپ.....

سوچتے ہوئے چلیے یہ ہی سمجھ لیں، میں وہ زمین ہوں جس پر دو اشخاص نے اپنی اپنی انا کی جنگ لڑی..... اور..... ڈاکٹر اور صوفیہ اور دونوں اپنی اپنی جنگ جیت گئے۔ بس.....

اوہ تو یہ ایشو ہے۔

صوفیہ! آپ کے لیے یہ معمولی بات ہے۔ اگر وقت ہو تو فیملی کورٹ میں ہفتہ کو چکر لگا لیجئے گا۔ یہ کہہ کر وہ واپس مڑی پر

Scanned with CamScanner

اٹھایا، اور وہ واپس جانے کے لیے کمرے سے باہر نکل گئی۔

صوفیہ کے جانے کے بعد ڈاکٹر عثمان نے (Beck Depression) کا سوالنامہ نکالیا۔ جس میں 21 نکتے بیان کیے گئے تھے کہ ہمیں اس بیماری کے لیے نئے انداز سے سوچنے کی ضرورت ہے۔

صوفیہ نے رات سونے کے لیے ڈاکٹر عثمان کی دی گئی گولیاں پانی کے ساتھ گھونٹ گھونٹ اندر اتاریں۔ کانوں میں گونجتی چیخیں آہستہ آہستہ مدہم ہوتی گئیں۔ اس نے تکیہ کو اپنی بانہوں سے بھینچ کر کانوں کے اوپر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔ کانوں میں لوری کے الفاظ گونج رہے تھے۔ ایسی آواز جسے وہ سننا ہی نہیں چاہتی تھی۔ بار بار آنکھیں کھل جاتیں اور آخر جانے کب وہ نیند کی وادیوں میں چلی گئی۔

ڈاکٹر عثمان ہسپتال جانے کے لیے صبح گھر سے نکلا اور جانے کب گاڑی مڑی راستہ خود بخود تبدیل ہوتا گیا۔ چونکا تو گاڑی کورٹ کے احاطے میں جا پہنچی۔ بغیر سوچے سمجھے وہ آگے چلتا گیا۔ کچھ بچوں کی چیخوں کو سن کر وہ اپنے حواسوں میں آیا اور سوچنے لگا ..... میں صوفیہ کا معالج ہوں یا وہ میری! مجھے اس کے دماغ کے اندر کے جالے کو صاف کرنا تھا۔ مگر یہاں میری سوچ کو اس نے مقید کر لیا ہے۔ یہ سوچتے ہوئے وہ آگے بڑھ رہا تھا۔ ایک چھ سالہ لڑکے کو ٹانگوں سے باپ گھسیٹ رہا تھا۔ کندھوں سے ایک برقعے والی عورت..... عورت کا برقعہ کھل گیا تھا۔ بال بکھر رہے تھے..... لیکن اسے ہوش نہیں تھی۔ دونوں پورا زور لگا رہے تھے۔ وکیل چیخ کر کہہ رہا تھا، تم دونوں بچے کے بارے میں تو سوچو کیا کر رہے ہو اس کی ساتھ..... لیکن دونوں کے کان بند ہو چکے تھے۔ اس سے آگے داڑھی والا بوڑھا آنسوؤں سے رو رہا تھا۔ میری بیٹی کو مجھے دے دو۔ اس کی ماں نیم پاگل ہو رہی ہے۔ خدا کے لئے چند دن کے لئے اسے ماں کے پاس چھوڑ دو..... اور وہ آدمی چھوٹی سی بچی کو گود میں لیے بھاگ رہا تھا..... اور ماں پیچھے پیچھے بھاگتے ہوئے پردے سے بھی بے نیاز ہو چکی تھی۔ عثمان واپس مڑا، ہسپتال کی جانب ڈرائیو کرنے لگا۔ ہسپتال جا کر بھی وہ بچے وہ چیخیں اس کا پیچھا کرنے لگیں۔ وہ سوچ رہا تھا انا کی جنگ کے میدان کارزار بنے یہ معصوم سے بچے۔

صوفیہ پھر کاؤچ پر لیٹی تھی..... اور ڈاکٹر عثمان ہمہ تن گوش تھا ریکارڈنگ کے لیے کیسٹ چل رہی تھی۔ ہاتھ میں قلم تھامے اس کی ذہن میں وہ رپورٹ گردش کر رہی تھی جسے امریکن سوشیالہ بک سوسائٹی نے 1998ء میں جاری کیا تھا۔ جس میں بتایا گیا تھا: وہ بچے جن کے والدین مسلسل جھگڑے کے بعد طلاق لے لیتے ہیں ان کے بچے 20 سال کی عمر میں ڈیپریشن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ Dawson نے ہی یہ تھیوری پیش کی تھی کہ ایسے بچے دمہ، سر درد اور دوسری نفسیاتی دباؤ میں رہتے ہیں جب اس نے صوفیہ کی طرف دیکھا تو وہ خاموشی سے پرس اٹھا کر باہر جا رہی تھی اور ڈاکٹر عثمان نے اپنی فائلیں سمیٹنا شروع کیں..... اور اگلے مریض کے لیے گھنٹی بجا دی۔ وہ سوچنے لگا ہمارا دماغ بھی یادوں کا قبرستان ہوتا ہے۔ جہاں ہم ایک بار ایک مردہ دفن کرتے ہیں اور ساتھ ہی دوسری قبر کی کھدائی شروع کر دیتے ہیں۔ میں تھک گیا ہوں۔ مجھے دماغ سے ان یادوں کو Delete کرنے میں کچھ تو وقت لگے گا۔ سیکرٹری کو بلا کر اگلی ایمپارٹمنٹس کو

Scanned with CamScanner

دوسرے مہینے شیڈول کرنے کے بعد.....وہ اپنے ٹکٹ فارن کرنسی کے چکر میں سب مریضوں کو بھول گیا۔

جب نیویارک کے ایک ہوٹل میں اپنا سامان کھول رہا تھا کہ جانے کہاں سے صوفیہ کے ہاتھ کا لکھا لفافہ اس کے کوٹ سے نکل اس کے ہاتھوں میں آ گیا۔

ڈاکٹر عثمان نے کارڈ دیکھا جس کی آخر میں صوفیہ کے باپ کا نام اور تصویر لگائی گئی تھی۔ ننھی سی گڑیا بابا کے ہاتھوں میں بہت محفوظ نظر آ رہی تھی۔

ڈاکٹر عثمان نے فون اٹھایا اور صوفیہ کے باپ مسٹر سبحان کریم کا نمبر ملا دیا۔ کال ملنے کے بعد وہ کہنے لگا، سبحان صاحب! آپ سے پندرہ منٹ پہلی تک نہ میں آپ کو جانتا تھا، نہ ہی نام پتہ تھا۔ کوٹ میں ہاتھ ڈالا تو صوفیہ کا کارڈ ہاتھ میں آ گیا، خدا نے شاید میری چھٹیوں کا پلان مجھ سے ہی اس لیے بنوایا تھا کہ میں آپ کو مل سکوں۔

سبحان: آپ ڈاکٹر عثمان صوفیہ اور مجھے کیسے جانتے ہیں؟

عثمان ہنسا اور کہنے لگا: سوری سر! میں آپ کو اپنا تعارف نہیں کروا سکا دراصل میں نفسیات دان ہوں اور اس کی امی میرے پاس لے کر آئی ہیں۔

اس کی ماں نے میری بچی کو دماغی مریض بنا دیا۔ ڈاکٹر صاحب میں نے پوری کوشش کی کہ مجھے مل جائے۔ لیکن میری بچی نے میرے منہ پر نفرت کا اظہار کیا اور کہہ دیا کہ وہ اپنی امی کے ساتھ رہنا چاہتی ہے۔ ڈاکٹر عثمان اگر آپ کل شام مجھے مل لیں تو بات کریں گے۔

یقین کیجئے میں تو یہاں صرف ریلیکس ہونے کے لئے چھٹیوں پر آیا تھا۔ یہ کارڈ آپ کا اچانک ملا تو میں حیران رہ گیا۔ اس شہر نا آشنا جسے چھوڑے زمانہ گذر گیا، وہاں پہنچا ہی ہوں تو یہ کارڈ دیکھ کر حیرت ہوئی۔

میری صوفیہ کو کیا ہو گیا۔ میری پھول سی بچی!

شام کو جب سبحان کریم نے ڈاکٹر عثمان کو کھڑے ہو کر خوش آمدید کہا۔ سبحان کہنے لگا اگر آپ نے تعارف کرواتے ہوئے یہ نہ بتاتے کہ آپ ماہر نفسیات ہیں تو آپ سے مل کر میں اندازہ ہی نہیں لگا سکتا۔ ماشاءاللہ! آپ تو ابھی کسی کالج کے طالب علم لگتے ہیں۔

ڈاکٹر عثمان: شکریہ!.....دراصل مجھے اس پیشے سے وابستہ ہوئے تو تھوڑی دیر ہوئی ہے لیکن میں نے تعلیم کی آغاز میں ہی بہت سے نفسیات دانوں اور ماہر نفسیات کو پڑھ ڈالا۔

سبحان: میری بیٹی کیا واقعی پاگل ہو گئی ہے۔

عثمان نے ہنستے ہوئے کہا۔ یہ آپ پڑھے لکھے لوگ بھی ذہنی مریض جو ماہر نفسیات کی پاس آئے اسے پاگل کیوں سمجھ لیتے

Scanned with CamScanner

ہیں۔ یقین کیجئے اتنی ذہین اور پُر اعتماد لڑکی، میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ وہ بے حد ذہین ہے۔

سبحان نے شکر کے انداز میں آنکھیں موند لیں۔

ڈاکٹر عثمان کہنے لگا اگر آپ کو بیٹی سے اتنی محبت تھی تو پھر..... میں بھی یہ سوچتا رہتا تھا اور اسی سوچ میں مَیں نے دس سال اس عورت کو برداشت کیا۔ میں سوچتا تھا، مجھے اس سے زیادہ نفرت ہے یا بیٹی سے محبت زیادہ..... اُس کی بدزبانی دن بدن زیادہ ہونے لگیں۔ ساری رات وہ لڑتی رہتی اور صبح میں ہانپتا کانپتا دفتر پہنچتا۔ میں نے ہر حربہ آزمالیا..... دو تین دفعہ گھر بھی بٹھایا، دو دفعہ طلاق کی دھمکی بھی دی لیکن کوئی سدھار نہیں آیا..... ہم دونوں میں کمیونکیشن گیپ دن بدن بڑھتا گیا اور پھر میں نے گھبرا کر طلاق دے دی۔ میں سوچتا کہ اگر ہم ساتھ رہے تو میری رگ پھٹ جائے گی۔ میں زندہ رہوں گا تو بیٹی کو پال سکوں گا۔ طلاق کے بعد وہ میری بیٹی کو لے کر غائب ہوگئی۔ میں نے ہر حربہ آزمالیا، عدالت کے دروازے کھٹکھٹائے..... لیکن وہ نہ ملی۔ آخر میں ملک چھوڑ کر چلا گیا۔

مجھے دوسری بیوی بہت اچھی ملی لیکن رات، صوفیہ آج بھی میرے کاندھے پر سونے کے لیے مجھے تلاش کر رہی ہے۔ میں کئی کئی راتوں اسے تلاش کرتا ہوں۔ پھر سوچتے ہوئے ڈاکٹر صاحب میرے بارے میں کوئی بات کرتی ہے؟ کیا وہ اب بھی مجھے مجرم سمجھتی ہے؟

ڈاکٹر عثمان نے اس کی غم سے نڈھال چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا: ''نہیں وہ اب سمجھدار ہوگئی ہے لیکن جو محرومی اس کی ذات کا حصہ بن چکی ہے وہ تو ختم نہیں ہوسکتی۔''

اتنے میں صوفیہ کی آواز گونجی: ''ڈاکٹر صاحب آپ نے مجھے ایمرجنسی میں بلالیا، میں اپنا پیپر ختم کرتے ہی آ گئی ہوں۔''

سبحان نے مڑ کر دیکھا گڑیا سی صوفیہ اس وقت ایک جوان حسینہ کے روپ میں کھڑی تھی۔ آنکھیں، بال، قد سب کچھ سبحان جیسا تھا۔ بس آواز، ہونٹ اور ناک ماں جیسے..... اچانک اس کی نظر سبحان پر پڑی۔ چند لمحے حیرت سے دیکھنے کے بعد وہ واپس مڑنے لگی۔ ڈاکٹر عثمان آپ سے مجھے یہ امید نہیں تھی۔ آپ نے مجھے Cheat کیا ہے۔ وہ مڑنے لگی تو ڈاکٹر عثمان راستے میں آ کر کھڑے ہوگئے۔

صوفیہ میں نے تمہارے ابو کو بلوایا ہے۔ تمہاری زیادتی ہے کہ جنگ میں تم نے ایک پارٹی کا ساتھ دیا..... تمہارے لیے تو دونوں برابر تھے۔ تمہیں جنگ کا میدان دونوں نے بنایا تھا۔ پھر تمہیں ایک طرف فیصلہ نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ آؤ بیٹھو۔

وہ خاموشی سے بیٹھ گئی۔ سبحان کی آنکھوں سے آنسو نکلنے کے لیے بے چین تھے۔ صوفیہ خاموشی سے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔

جانے اس طرح بیٹھے کافی وقت گزر گیا۔

آخر ڈاکٹر عثمان بولا: سبحان صاحب میں آپ سے بیٹی کا ہاتھ مانگتا ہوں..... کیا آپ مجھے اپنے داماد کے روپ میں قبول کریں گے۔

صوفیہ بولی: آپ کو میری مما سے بات کرنی چاہیئے۔ تو ڈاکٹر عثمان نے کہا صوفیہ آپ مسلمان ہیں، آپ جانتی ہیں، اسلام میں.....

☆☆☆☆

Scanned with CamScanner

آدھی، آدھا

ساجد عمر گل

اللہ رکھیا! اب زمانہ ہی کچھ ایسا آ گیا ہے، رب کے کاموں کا کچھ پتہ نہیں چلتا.....

چودھری رب نواز نے ہمیشہ کی طرح آدھی سی بات کی اور حقے کی نڑی منہ میں ڈال کر گڑ گڑ کرنے لگا۔ اس کا کمی اللہ رکھا جو اپنے چوہدری کی عادت سے خوب آگاہ تھا، اس نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا اور خاموش رہا۔

چوہدری رب نواز جوانی میں ایسا نہ تھا۔ کسرتی بدن والے کبڈی کے کھلاڑی چوہدری رب نواز کے نین نقش بھی دیکھنے والے تھے۔ جوان الہڑ مٹیاریں اُس پر جی جان سے مرتی تھیں مگر وہ اپنی موج اور لنگوٹ کا پکا تھا۔ اپنے باپ بڑے چوہدری کے ساتھ پنچائت میں بیٹھتا تو باتوں سے اگلے کا دل جیت لیتا۔ بڑے بزرگوں کی موجودگی میں فیصلے کرتا تو کبھی انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑتا۔ قریبی گاؤں کے چوہدریوں کے ہاں اُس کی شادی ہوئی۔ چوہدرانی لاکھوں میں ایک تھی۔ مگر مزاج کی کچھ تیکھی۔ چوہدری رب نواز کا دھیما پن کارگر ثابت ہوا۔ دونوں کی اچھی نبھنے لگی۔ شادی کے دوسرے سال چوہدرانی پیٹ سے ہوئی تو شہر میں بسنے والے اپنے سرکاری افسر بھائی کے پاس چلی گئی۔ چوہدری رب نواز بچے کی ولادت سے چند روز پہلے شہر چوہدرانی کے پاس پہنچا۔ سب گاؤں والے اُن کی واپسی کے شدت سے منتظر تھے مگر کافی روز کے بعد چوہدری رب نواز اکیلا ہی گاؤں لوٹ آیا۔ گاؤں بھر میں اُس کے یوں اکیلے واپس چلے آنے پر بہت سی باتیں ہوئی مگر جانے چوہدری رب نواز کے من میں کیسی گرہ بندھی تھی کہ کوئی بات اُس کے من سے اٹھ کر لبوں تک نہ آ پائی۔ اُدھر چوہدرانی بھی گاؤں لوٹ کر نہ آئی۔ اُس کے ہاں بیٹا ہوا کہ بیٹی کسی کو کچھ خبر نہ تھی۔ آہستہ آہستہ چوہدری رب نواز کی جوانی کو گھُن لگنے لگا۔ رب نواز کبڈی اور کسرت چھوڑ کر حقہ پینے لگا۔ پنچائت کے معاملات میں بھی اُس کی دلچسپی کم سے کم ہوتی گئی۔ گاؤں والے کچھ عرصہ تو اُس کی حالت سے پریشان رہے لیکن پھر وہ بھی اپنی اپنی زندگی کے معمولات میں کھو گئے۔

اب گزرتے وقت نے چوہدری رب نواز کو پچاس کی منزل پر لا کھڑا کیا تھا اور اُس کے باپ کو گزرے دس برس بیت چکے تھے۔ گاؤں میں الیکشن ہونے والے تھے۔ کچھ عرصہ سے چوہدری رب نواز گاؤں والوں کے بے حد اصرار پر حویلی سے نکل کر شام سے پہلے ہی ڈیرے پر آ بیٹھتا۔ لوگ اکٹھے ہو جاتے۔ صلاح مشورہ اور حقہ پانی کرتے۔ رات

پڑتے ہی اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاتے۔

دوپہر ابھی پوری طرح ڈھلی نہ تھی مگر بدلتے موسم کی گرمی کا زور ٹوٹ چکا تھا اور دھوپ میں گھلی ملی کچھ ٹھنڈی میٹھی ہوا چوہدری رب نواز کے ڈیرے پر ہلکارے لیتی خوب موجیں مار رہی تھی۔ چوہدری کا من آج حویلی میں جانے کیوں نہ لگا تو شام سے پہلے ہی ڈیرے پر آ بیٹھا۔ اللہ رکھے نے پھرتی سے لال بڑے پائیوں والے نواڑی پلنگ کی پائنتی پر کورا کھیس ڈالا۔ پھول کڑھے تکیئے کو تھپتھپا کر سرہانے کی طرف رکھا۔ چوہدری خاموشی سے سب دیکھتا ہوا من ہی من میں سوچوں کے جانے کن بھنوروں میں ڈوبتا ابھرتا رہا۔ اللہ رکھے نے اپنے چوہدری کے کچھ بدلے ہوئے تیور کی کڑواہٹ کو محسوس تو کیا مگر پوچھنے کی ہمت اس میں پہلے کبھی نہ تھی تو اب کیا ہوتی؟ موسم بدلے نہ بدلے، چوہدری ڈیرے پر شام سے ذرا پہلے آنے کی بجائے دوپہر ڈھلتے ہی آ جائے، چپ چاپ حقہ پیتے ہوئے کوئی آدھی ادھوری بات کہے نہ کہے، اس سب کے بارے سوچنا نہ تو اللہ رکھے کے ذہن کی رسائی میں اور نہ ہی خدمت گذاری کے اختیار میں تھا۔ اس کا ذمہ تھا ڈیرہ صاف رکھنا۔ آئے گئے کیلئے لسی پانی کا انتظام کرنا۔ چوہدری کا حقہ ہمیشہ تازہ رکھنا اور اس کے بڑے لال پائیوں والے نواڑی پلنگ کے سامنے نیم دائرے کی شکل میں پڑے موڑھوں کی ترتیب جمائے رکھنا۔ پرانا خادم ہونے کی وجہ سے وہ اپنے چوہدری کا مزاج آشنا تھا۔ اسے کب کس شے کی حاجت ہوتی ہے، وہ کب کیا چاہتا ہے، اس کے من میں کیا کھد بد چلتی ہے، اللہ رکھے کو سب معلوم پڑتا تھا۔ وہ جو بھی کچھ تھا سب کا سب اپنے چوہدری کی دین تھا۔ البتہ سر نیہوڑائے ہمیشہ چوہدری کے آس پاس رہنے کی عادت اس کی اپنی تھی جو چاندی بھرے بالوں کی عمر میں کندن کی طرح پک چکی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ چوہدری رب نواز ہمیشہ کی طرح کوئی آدھی ادھوری بات کہہ کر خاموش ہو گا اور پھر کچھ دیر میں خود ہی اسے کھردری سی آواز دے گا۔

''اللہ رکھیا! او اللہ رکھیا''

کڑوے تمباکو والے حقے کا کش کھینچے گا اور اگر اُس کا من چاہا تو خود ہی بولنا شروع ہو جائے گا۔ آج بھی اللہ رکھا مطمئن سا معمول کے مطابق اپنے چوہدری کی خاموشی پر دھیان لگائے، سر نیہوڑائے بیٹھا تھا کہ پھر اچانک جیسے اس کے سر پر ڈیرے کے بڑے کمرے کی چھت کا بھاری شہتیر آ گرا۔ اس کے کانوں میں ساں ساں ہونے لگی۔ چہرہ حیرت سے مزید ہونق ہو گیا۔ جیون میں پہلی بار اس نے چوہدری رب نواز کو انتہائی دکھ کے عالم میں ''ہائے اوئے ربا سوہنیا یہ کیا زمانہ آ گیا ہے؟'' کہتے سنا تو اللہ رکھے کی سوچنے سمجھنے کی سب صلاحیت ساکت ہو گئی۔ وہ ہکا بکا چوہدری کا منہ دیکھنے لگا۔

Scanned with CamScanner

چوہدری کی اَن دیکھی سی کیفیت مزید کھلنے کا انتظار اللہ رکھے پر قیامت ڈھانے لگا۔ اس نے اپنے چوہدری کا یہ انداز پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ غم جتنا بھی ہو، خوشی جیسی بھی ہو، اس کا اظہار نہ کرنے کی عادت چوہدری رب نواز کی اپنی پختہ حویلی جیسی ہی تھی۔ مگر آج کچھ انہونا تھا۔ اللہ رکھے نے چوہدری رب نواز کو اُس کے من پر بیتنے والی کو زبان پر یوں لاتے ہوئے زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ حیرانی کے سانپ اسے ڈسنے لگے۔ چوہدری کی پوری بات سننے کے انتظار کا زہر اس کے رگ وپے میں سرایت کرتا جا رہا تھا۔ اس نے پہلو بدلا اور جانے کیسے ہمت جُٹا کر بول ہی دیا۔

''چوہدری جی اج خیر تے ہے جی؟''

چوہدری رب نواز نے حقے کا کش کھینچا اور اپنے خاص کمی کی میلی گدلی سی آنکھوں میں تیر کی طرح سیدھا دیکھتے ہوئے کہا۔ ''سن اوئے اللہ رکھیا! تجھے پتہ ہے رب کی بے پرواہیاں بندے کو مار ہی دیتی ہیں....''

چوہدری رب نواز نے حقے کی نڑی منہ میں ڈالی، لمبا کش لگایا، نڑی منہ سے نکالتے نکالتے وہیں چھوڑی اور پھر سے کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اللہ رکھے کی حیرت اور انتظار نے اُس کے اندر باہر کی حالت ایک کر دی۔ اس نے تو سوچا تھا کہ آج یقیناً چوہدری صاحب اسے کوئی خاص بات سنائیں گے مگر دوسری طرف ڈھاک کے تین پات وہی پہلے والے تین کے تین ہی رہے۔ اللہ رکھے نے آنکھیں بڑی مشکل سے جھپکائیں اور پھر سے سر نیہوڑا کر اپنے کھردرے پیروں کے میل بھرے ناخن کھرچنے لگا۔ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ کب تک وہ ایسی حالت میں ہونق بنا بیٹھا رہا۔ اسے ہوش تب آیا جب چوہدری رب نواز کی آواز اس کے کانوں سے ہوتی ہوئی دیر کے بعد اس کے سر پر گری۔ پرانی وضع کے خاندانی مزاج والے چوہدری رب نواز کی آواز میں کچھ ایسا گہرا پن ضرور تھا کہ جس کی تہہ تک جانے کی سکت اللہ رکھے میں نہ تھی۔

''اٹھ اوئے اللہ رکھیا! حویلی سے کوئی لسی پانی لے آ۔ شام ہونے سے پہلے سب کام مکا۔ لوگ ڈیرے پر آنے ہی والے ہوں گے''۔

وہ ہڑبڑایا۔ ہاں کے انداز میں سر ہلاتا ہوا اُٹھا اور سست قدموں سے ڈیرے سے باہر والی پگڈنڈی پر ہو لیا۔ کھیتوں کے اُس پار پنڈ ''پاکاں نروئے'' میں واقع چوہدریوں کی پکی حویلی دور سے سر اٹھائے اللہ رکھے ہی کو آتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ حویلی تک پہنچتے پہنچتے اللہ رکھے کے پیروں نے معمول سے زیادہ کی رفتار پکڑ لی۔ پکی حویلی راستہ نہ روکتی تو

Scanned with CamScanner

اللہ رکھا جانے کہاں کا کہاں نکل جاتا۔ وہ حویلی کے پرانی بھاری لکڑی کے بنے بڑے دروازے پر پہنچ کر دم لینے کو رُکا۔ اس سے پہلے کہ چوہدری صاحب کی نئی کیفیت کا اثر اس کے ذہن کو پھر سے اپنے حصار میں لیتا اُس نے زور سے اپنا سر جھٹکا اور تیزی سے اُلانگ کر دروازے کے اندر واقع وسیع صحن میں پہنچ گیا۔ اُسے اندر آتا دیکھ کر رجو دور ہی سے بولی ''بابا رکھیا! سب کچھ تیار ہے، دِینے کو ساتھ لے اور سب اُٹھا لے جا''۔

دِینا' دین محمد' اللہ رکھے کا سوہنا بیبا پُتر۔ لڑکپن ابھی اُس کے ہاتھوں سے پوری طرح نکلا نہ تھا مگر چوہدریوں کا کمی ہونے کی وجہ سے مسیں بھیگنے سے پہلے ہی سیانف اُس کے مکھڑے پر تمبوتان رہی تھی۔ ہنسنے کھیلنے کی عمر میں کمی کے پتر کی کے ہڈ پیر چوڑے ہو گئے تھے۔ بھاری سے بھاری سامان اُٹھانے اور مشکل سے مشکل تھکا دینے والے کاموں سے اُسے کوئی دِقت نہ ہوتی تھی۔ ڈیرے پر جانے والے سامان کی پوٹلیاں باندھے، مسّی روٹیوں کی بھاری چنگیریں اور منہ تک بھرے لسی کے برتن اٹھائے وہ تیار کھڑا تھا۔ چٹنی، دہی کے ڈوہنگے، صاف دھلے دھلائے لشکتے گلاسوں کے ساتھ البتہ زمین پر ہی پڑے تھے۔

اللہ رکھا دِینے کے ساتھ ڈیرے پر جانے والا سامان اٹھائے حویلی سے نکلنے ہی والا تھا کہ رجو دوڑتی ہوئی اُس کے پیچھے آئی اور بولی ''بابا رکھیا سنا ہے چوہدرانی شہر سے اپنے مائیکے گاؤں آئی بیٹھی ہے۔ چوہدری جی کا یار رحیم بخش سویرے حویلی آیا تھا یہ خبر دینے۔ وہ تو حقہ پانی کر کے چلا گیا مگر جب چوہدری جی بیٹھک سے اٹھ کر اندر آئے تو کچھ پریشان سے تھے۔ آج وہ بے وقتے ڈیرے پر بھی چلے گئے ہیں۔ رب خیر کرے۔ بابا رکھیا چوہدری جی کا خیال رکھیں''۔

حویلی سے باہر نکل کر وہ ڈیرے کو جانے والی پگڈنڈی پر چڑھنے ہی والے تھے کہ بائیں جانب نکے پنڈ سے آتے ہوئے راستے پر انہوں نے چھمو میراثن کو دیکھا۔ پکی عمر میں بھی چھمو چلتے ہوئے اپنی کمر لچکاتی اور کولہے مٹکاتی تھی۔ مگر آج اُس کی چال میں اور ہی کچھ نرالا تھا۔ اُس نے دور سے اللہ رکھے کو دیکھا تو آواز دی۔

''وے رکھیا! سنتا ہے؟ چوہدری رب نواز کی گھر والی اپنی اولاد کے ساتھ اپنے مائیکے آئی بیٹھی ہے۔ میری شاداں وہیں پر تھی۔ اس نے بتایا ہے کہ چوہدری کی اولاد ادھی زنانی اور ادھا بندہ ہے.....''

ادھی زنانی، ادھا بندہ؟

اُس کے من میں دیوانے ہوئے جاتے ڈنگر زور زور سے ڈکرانے لگے۔ آج تو انہونی پر انہونی ہو رہی ہے۔ اُس نے قریب آتی چھمو کو نظر انداز کیا اور تیزی سے قدم ڈیرے کو جاتی ہوئی پگڈنڈی پر دھر دیئے۔ دِینا تقریباً بھاگتا ہوا اُس تک پہنچا۔

Scanned with CamScanner

پیچھے سے آتی چھمو میراثن کی آواز حویلی اور ڈیرے کے درمیانی وسیع رقبے پر یوں زور سے گونجی کہ اللہ رکھے کو اٹھایا ہوا سامان سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

چھمو کہہ رہی تھی ''رکھیا! زمانہ بدل گیا ہے۔ اب چوہدریوں کے جنے بھی ہماری طرح ناچ گانا کرتے ہیں۔ اب تو بھی میری دِید کریا کر''۔

اللہ رکھا اور اُس کا پتر دِینا ڈیرے پر پہنچے تو دیکھا کہ چوہدری صاحب اپنے رنگین پائیوں والے بڑے سے نواڑی پلنگ سے حقے سمیت غائب تھے۔ اللہ رکھے کیلئے یہ صورتحال ایک اور انہونی تھی۔ چوہدری صاحب ڈیرے پر بچھے پلنگ پہ ایک بار بیٹھ جاتے تو ساری شام بیٹھے ہی رہتے تھے۔ تو آج یہ کیا ہوا؟ انہونی کے سانپوں نے ڈیرے کی چھت سے پھن پھیلا پھیلا کر اللہ رکھے کو دیکھا۔ وحشت اُس کے ماتھے پر جوانی والا پسینہ لے آئی۔ اُس نے اُٹھایا ہوا سامان جلدی سے نیچے رکھا اور ڈیرے کے بڑے کمرے کی طرف بھاگا۔ بڑے کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ زور لگانے پر بھی نہ کھلا تو رکھا بھاگتا ہوا بغلی کھڑکی تک جا پہنچا۔ اُس نے دیکھا کہ چوہدری رب نواز اپنے حقے سمیت الٹا بکھرا اوندھے منہ زمین پر پڑا تھا۔ اللہ رکھا تو گویا مرنے ہی والا ہو گیا۔ یہ منظر اُس نے زندگی بھر کی خدمت گزاری میں پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ چوہدری صاحب کو آواز دے کر اپنی طرف متوجہ کرتا، کچھ اور پرے لوگ ڈیرے پر پہنچ گئے۔ آنے والوں میں ایک پینٹ بُشرٹ والا، لمبے بالوں اور کانوں میں بالیاں پہنے بظاہر مرد مگر عورتوں کی چال چلتے ہوئے مہمان کو دیکھ کر اللہ رکھے کے پیروں نیچے سے زمین نکل گئی۔ اندر بند پڑے چوہدری صاحب اور باہر یہ منظر۔ بھونچال نے اللہ رکھے کی میلی گدلی آنکھوں کو جیسے اندھا ہی کر دیا۔ وہ بڑی مشکل سے بغلی کھڑکی کو چھوڑ کر بڑے کمرے کے دروازے تک پہنچا جہاں کچھ شہری لوگوں سمیت آنے والا پہلے ہی پہنچ کر اُسے پیٹ رہا تھا۔ دروازہ نہ کھلنے پر وہ اونچا اونچا بولنے لگا۔

''ابا جی دروازہ کھولیں؟ آپ بے وقت حویلی چھوڑ کر ڈیرے پر آ چھپے ہیں۔ آخر مَیں ہوں تو آپ کی اولاد ہی۔ شہر کا امیر اور مشہور آرٹسٹ ہوں۔ صرف ناچنے گانے والا ہیجڑہ نہیں۔ اب تو حکومت نے مجھے شناختی کارڈ بھی دے دیا ہے''۔

ادھی زنانی ادھے بندے جیسا آنے والا تیزی سے بولتا ذرا دم لینے کو رُکا تو چوہدری رب نواز کی ہولناک چیخ سارے میں گونج گئی۔ اللہ رکھا پھر بھاگتا ہوا بغلی کھڑکی تک پہنچا۔ اندر چوہدری رب نواز کے حقے کی دھاتی ٹوپی اُس کی کھوپڑی میں گھسی ہوئی تھی۔ چوہدری صاحب کی آدھی ادھوری باتیں آج مکمل ہو گئی تھیں اور تیورا کر گرتا ہوا اللہ رکھا انہیں پورے کا پورا جان سمجھ چکا تھا۔

☆☆☆☆☆

Scanned with CamScanner

تین اور چار اپریل کی شب جاگتے رہنا

(کہانی)

حشمت لودھی

میں آج تین اور چار اپریل کی درمیانی شب اپنے باپ کی چوتھی نسل سے اس کا تعلق جوڑنے کے جتن میں اپنے دو پوتوں سے مخاطب تھا..... میں نے سنا کہ میں کہہ رہا ہوں کہ ''میرے بچو.....! آج تین اور چار اپریل کی درمیانی رات ہمیں جاگنا ہے..... رات بھر..... صبح تک جاگنا.....! کہ اس رات ایک پری زادہ ہمارے بے در و دیوار آنگن سے ہمیں پکارتا ہے..... اور تب ہمیں ہمیشہ کی طرح ہوتا ہوا پا کر لوٹ جاتا ہے..... بچو.....! مرے بابا، تمہارے بڑے ابا نے بتایا تھا کہ یہ اچھا نہیں ہوتا..... یہ پری زادے، ہمارے دوست ہیں..... وہ تمہارے لئے اچھے اچھے کھلونے لاتے ہیں..... اچھی اچھی باتوں سے ہمارا جی بہلاتے ہیں.....''

آپ مانیں کہ بچے باشعور ہوتے ہیں کہ بے یقین ہوتے اور سوال کرتے ہیں..... مین نے آج جب ان بچوں کی آنکھوں میں ''کیوں'' اور ''کیسے'' کے تیر ترازو ہوتے دیکھے تو ندیم سے مخاطب ہوا جو دونوں میں قدرے بڑا ہے اور بڑوں پر کچھ کچھ یقین بھی کرنے لگا ہے..... میں اس سے کہہ رہا تھا کہ ''بچے.....! یقین مانو.....! پہلے پہل یہ پری پیکر شہزادہ میرے باپ کے بے در و دیوار آنگن میں آج سے کوئی نصف صدی ادھر بھی آیا تھا..... تب میرا باپ سویا ہوا تھا..... یقین کرو کہ اس نے میرے باپ کو جگا دیا تھا..... مگر پھر وہ سویا ہوا کہ کچھ تو شہزادے کی اپنی غفلت اور کچھ ہم آدم زادوں کی خصلت کہ ہم ذرا کم کم ہی جاگتے اور دیر تک سوتے ہیں..... پس میرا باپ بھی ایک بار جاگا اور پھر سو گیا.....!''

میں نے ندیم کی آنکھوں میں جھانکا..... اور ان میں بے یقینی کے سائے لہراتے دیکھ کر مزید گویا ہوا..... ''میرے بچے تین اور چار اپریل کی درمیانی رات تھی کہ تب یہ سن 1979ء کا رہا تھا۔ اس رات بھی شہزادے نے ہمارے بے در و دیوار آنگن میں کھڑے ہو کر کئی مرتبہ پھر ہمیں پکارا تھا..... یہ تب کی بات ہے کہ جب دیو زادوں کا سردار اسے ہم آدم زادوں سے محبت کے الزام میں مارنے جا رہا تھا..... یہ ایک تاریک اور سیاہ رات تھی..... شہزادہ صدا دیتا رہا..... پکارتا رہا..... ہواؤں سے الجھتا رہا..... مگر تب بہت دیر ہو چکی تھی..... اس وقت تک بستی کے سب آدم زاد کچھ تو خوف اور کچھ اپنی عادت کے سبب سو چکے تھے..... تب وہ پری زادہ ہنستے مسکراتے پھانسی پر جھول گیا..... بچو.....! وہ دن اور آج کا دن..... وہ ہمیں اور ہم اسے تلاش کرتے ہیں!''

ندیم میری بات پر یوں سر ہلانے لگا جیسے اسے میرے کہے اور اپنے سنے پر یقین آ گیا ہو..... لیکن چھوٹا کہ ابھی چھوٹا ہی تو ہے

Scanned with CamScanner

.....اس لئے اس نے بے یقینی اور یقین کے درمیانی فاصلے کو سوال کر کے پاٹنا چاہا.....اور کہا کہ بابا یہ آدم زاد، پری زاد اور دیوزاد کیا ہوتے ہیں.....؟ میں آج اپنے باپ کو شہزادے کی پہلی صدا سنائی دیئے جانے کے وقت سے نصف صدی کے فاصلے پر تھا.....انشال کے سوال پر چونک اُٹھا.....جیسے کسی گہری نیند کے خواب سے جگا دیا جائے..... مجھے یاد آیا کہ 37 سال پہلے تین اور چار کی شب میں نے بھی اپنے باپ کو جگا کر پوچھا تھا کہ ابا.....! یہ شہزادہ کون تھا کو پھانسی پر جھول گیا.....؟

آج اتنے برسوں بعد میرے باپ کی یاد ہے، میں ہوں اور میرے یہ دو پوتے ہیں۔ بس درمیان میں جو ایک اور ہونا چاہیئے تھا وہ کہاں ہے.....؟ میں نے سوچا کہ شاید ہم آدم زادوں کی یہی تقدیر ہے.....اکثر ہمارے درمیان کی کڑیاں ٹوٹ جاتی ہیں.....ہم انہیں جوڑ نہیں پاتے.....اپنے خواب اگلی نسل کو منتقل نہیں کر پاتے.....اس لئے مجھے آج انشال کے سوال کو دو نسلوں کے درمیان پل کے طور پر استعمال کرنا ہے.....بے یقینی اور یقین کے درمیان کا پل.....جو جواب میرے باپ نے مجھے دیا.....جو خواب اس نے دیکھا.....جو دکھ اس نے جھیلے آج مجھے وہ منتقل کرنا ہیں.....

میرا باپ مجھے کہہ رہا تھا کہ بچے.....!

یہ سن 1967ء کا رہا تھا۔ دسمبر کا پہلا دن.....ایک روشن دن.....اس روز ملک بھر کی غریب بستیوں کے بے در و دیوار آنگنوں میں ایک پری زادے کا بہت چرچا رہا.....وہ خواب بیچتا تھا.....غربت اور جہالت سے، ظلم اور بیماری سے..... بھارت کی مکاری اور امریکہ کی عیاری سے نجات کے خواب.....''

مجھے سنائی دیا ابا کہہ رہے تھے کہ ''گو ہم سن سنتالیس کے خواب کی تعبیر سے سہمے ہوئے تھے.....مگر اس روز اس خوابوں کے شہزادے کی آواز پر ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے تھے.....وہ عجیب شہزادہ تھا جو جاگتی آنکھوں کے خواب بیچتا.....ظلمت کدے میں آفتاب بیچتا تھا۔ جن کٹیاؤں میں کبھی مٹی کا دیا بھی روشن نہ ہوا تھا.....وہ ان کے مکینوں کی پلکوں پر آزادی و خوشحالی اور آس و امید کے دیپ جلاتا چلا جا رہا تھا''۔ ابا بتا رہے تھے کہ.....''عجیب سحر تھا اس کی آواز میں.....کٹیاؤں والے اس کے سحر میں خواب جبکہ محلوں والے عذاب دیکھتے تھے.....اس کی بانسری کی لے پر ذلت کے مارے مزدور و کسان ناچتے گاتے ایک خواب و خیال جنگ میں بغیر کسی تیاری اور بلا کسی نظم کے بے خطر کود پڑے.....اس کی اس دُھن کو دھن والوں نے..... مالکی راگ.....اپنا نوحہ جانا.....اور عیاری و مکاری سے لے کر توپ تفنگ تک سے مسلح ہو کر.....ہم ذلت زادوں پر ٹوٹ پڑے.....ملک کے ہر ہر محلے اور گلی کوچے میں آدم زادوں اور دیوزادوں میں وہ رن پڑا کہ الاماں والحفیظ.....سر بھی پھوٹے.....خون بھی بہا.....القصہ

میں نے اِک بُت کو تراشا دیکھا
اور پھر ..... اپنا تماشا دیکھا

ابا نے ایک ٹھنڈی سانس بھری.....ذرا رک کر بولے کہ ''بیٹا میں اس روز بہت رویا کہ جس روز راج سنگھاس پر شہزادے کے دائیں بائیں انہی کو بیٹھے پایا جو انہتر کے یودھ میں ہمارے مقابل تھے.....عجب شہزادہ تھا کہ ہمیں دشمن کے ساتھ پورے طور لڑا بھی نہ سکا.....! اور دشمن کو زخمی کر کے کھلا چھوڑ دیا''۔ ابا کی آواز رندھ گئی..... بہت دھیمی آواز میں کہنے لگے.....کہ ''ہمارا شہزادہ'' عجب جواری تھا.....جس نے سرمایہ دار گولوں اور جاگیردار جوکروں کے سر پر بلف کھیلنا چاہا.....مگر کبھی بھروسہ نہ کیا اپنی، ہم محنت کشوں اور کسانوں کی ٹریل پر.....ایسے میں جو ہونی تھی وہ ہو کر رہی.....اس کی اپنی زندگی تو داؤ پر تھی ہی شہزادہ ہماری جنگ بھی ہار گیا.....'' ابا اُداس ہو گئے تھے۔ اپنی جنگ ہارنے پر نہیں شہزادے کے انجام پر.....

Scanned with CamScanner

میں نے دیکھا..... چھوٹا بے یقینی اور یقین کے درمیان اپنے سوال کے پل پر آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا..... وہ تیسرا جسے میرے اور میرے پوتوں کے درمیان موجود ہونا چاہیے تھا..... اپنے کمرے میں فیس بک پر اپنے دوستوں سے چیٹ میں مصروف تھا..... اس کے اپنے خواب تھے میرے اپنے..... میں نے اپنے باپ کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے اپنے آپ کو بولتے سنا..... میں کہہ رہا تھا کہ.....

"چوتھی نسل کے جیالے بچو!

یہ کہانی ہے ادھورے خوابوں کی..... پرستان کے شہزادے کی، جو آدم زاد سے محبت کا سزاوار ٹھہرایا گیا..... جسے دیوزاد نے غلاموں کو خوشحالی کی نیلم پری کے خواب دکھانے کا مجرم گردانا..... اپنے شہزادے کا راج پاٹ گیا..... اس کے شہزادے خون میں نہلائیے گئے..... سسی اس کی گھبرا کر پتھر ہوئی..... شہزادی دربدر..... جس کی دربدری جنات کے ہاتھوں شہزادی کی شہادت پر ختم ہوئی.....

بچو..... ! یہ سزا تھی کچی محبتوں کی..... شہزادہ اپنے حصے کی سزا پا کر تین اور چار کی درمیانی شب سرخرو ہوا..... رہے ہم آدم زاد تو اس سے محبت کی سزا آج تک بھگت رہے ہیں۔ شہزادہ خود تو اپنے حصے کی سزا پا کر سرخرو ہوا..... مگر راستہ ہم آدم زادوں کا کھوٹا کر گیا..... جیالے بچو!..... کہاں تک سنو گے، کہاں تک سناؤں؟ بس یوں سمجھو کہ جو اس ملک کے غریب غربا کو شہزادے کے عشق میں اپنا راستہ کھوٹا کرتا دیکھتا ہے..... جس نے بھی ادھورے خوابوں کے ساتھ انہیں تھلوں میں آبلہ پا دیکھا..... ! جو آج اپنے شہزادے کے تخت سلیمانی پر مسخروں، بھانڈوں کو بیٹھا پائے گا..... جو کروں اور گولوں کو محنت کشوں پر زبان دراز کرتے سنے گا جو بھی ہمارے شہر بھنبھور کو ٹھگوں کے ہاتھوں لٹتا دیکھے گا..... اس کے لئے امر لگ چکا ہے کہ وہ شہزادے کے لوٹ آنے کا انتظار کرے..... یودھ پھر پڑے گا۔ رَن سے ایک بار پھر بلاوا آئے گا، سر پھوٹیں گے..... خون بہے گا..... خون میں غم بھی بہہ جائیں گے....."

میں شاید رو رہا تھا..... مجھے میری آواز دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی..... میں سن رہا تھا "آدم زادو..... ! میرے بچو..... ! یقین مانو..... کہ جس کسی نے شہزادے کے عشق میں ایلی ایلی لیما سبقتنی کی تال پر خود سوزی کا رقص دیکھا ہے..... ماؤں کو اپنے بچوں کی پیٹھ پر لگے کوڑوں کے زخموں کو چومتے دیکھا یا جیالوں کے شاہی قلعے میں عذابِ عشق سہنے کے قصے سنے ہیں وہ تین اور چار کی درمیانی شب سو کیسے سکتا ہے..... اسے تو جاگنا ہے پُو پھٹنے تک جاگنا ہے.....

ندیم تم بھی انشال تم بھی دیکھنا..... جاگنا، رات بھر جاگنا، پُو پھٹنے تک جاگنا، شہزادہ ضرور آئے گا..... !

Scanned with CamScanner

شاہین مفتی

ایک صبح

چاروں طرف صحن کے
چڑیاں چہک رہی ہیں
بیٹھے ہوئے ہیں چھت پر
کچھ اور بھی پرندے
سرما کی دھوپ جن میں
خیرات بانٹتی ہے
گذری ہے آسماں سے
بادل کی اک سواری
کیا ریشمی قبا تھی
اُڑتی ہوئی پتنگیں
مڑ مڑ کے دیکھتی ہیں
کسی دور کی گلی میں
بچوں کے کھیلنے کی
آواز آ رہی ہے
ٹھہری ہوئی ہوا میں
ہلکا سا اک نشہ ہے
ہر سمت روشنی کا
میلہ لگا ہوا ہے

شہناز پروین سحر

نظم

غبارِ وقت میں اب کس کو کھو رہی ہوں میں
یہ بارشوں کا ہے موسم کہ رو رہی ہوں میں
یہ چاند پورا تھا بے اختیار گھٹنے لگا
یہ کیا مقام ہے کم عمر ہو رہی ہوں میں
اس ابر باراں میں منظر برسنے لگتے ہیں
برس رہی ہے گھٹا بال دھو رہی ہوں میں
میں گرد باد کا اک سر پھرا بگولہ تھی
خلائیں اوڑھ کے روپوش ہو رہی ہوں میں
یہ شام وقت سے پہلے چھپا نہ دے سورج
سنہری دھوپ میں چنری بھگو رہی ہوں میں
اداس اوس میں گم گشتہ آنسوؤں کی کسک
لرزتی کانپتی مالا پرو رہی ہوں میں
خلاء ۔ میں کھو گئیں باتیں، ہنسی کی آوازیں
سخن شکستہ ہوں الفاظ کھو رہی ہوں میں
میں جی رہی ہوں یا جینے کا وہم ہے مجھ کو
نہ جانے جاگ رہی ہوں کہ سو رہی ہوں میں
یہ زردِ شام جو سورج گنوائے بیٹھی ہے
سحر ستارۂ افلاک ہو رہی ہوں میں

Scanned with CamScanner

ایک اور آخری دن

ان پڑھ
جاہل
گھامڑ عورت
تیرے ساتھ اب ایک پل بھی
میں نہیں رہوں گا
ابھی خریدوں گا اشٹام اور
آج ہی ہو گی لکھت پڑھت سب
آج یہ قصہ
ختم سمجھ لے
تیرے بعد تو جو بھی آئی
تجھ سے زیادہ بہتر ہو گی
میرے ساتھ یہ
آج اترا
بس آخری دن ہے۔۔۔۔۔۔۔۔
میرے ابو
اس دنیا کے سب سے اچھے ابو ہیں
لیکن آج
ذرا غصے میں تھے
تو نے۔۔۔۔۔
ارے! تو نے
میرے سارے قیمتی کاغذ اور کتابیں
ردی والے کو
دے ڈالیں
آج تو خمیازہ بھگتے گی
چل۔۔۔۔
بچی کو ساتھ میں لے
اور
میرے پیچھے چلتی آ
ماں نے اپنا برقع پہنا
پھر
میرے ننھے پیروں میں
اونچی ایڑی والی ٹپ ٹپ کرتی
جھلمل سی جوتی پہنائی
میری انگلی کو تھاما
اور
ابو کے پیچھے پیچھے چل دی
تیز قدم ابو
اور ان کے پیچھے
آنسو پونچھتی
سست روی سے چلتی ماں
امی!
آج کہاں جائیں گے؟

اختر کاظمی

اپنی خوشیوں اور غموں کا بوجھ

پیارے کون کسی کی آگ میں جلتا ہے
اکثر دعوے کرنے والے
اک دوجے کی آنکھوں میں جھوٹے وعدوں کی
ریت جھونکتے رہتے ہیں
تو جانے کس دنیا کی باتیں کرتا ہے
کون سی آس میں سب کے دکھوں کو
اپنا دکھ کہتا رہتا ہے
چاروں جانب رنگ برنگے پیار بھرے
لفظوں کے پیراہن لہراتے دیکھتا ہے تو
جن میں چھپی نفرت کی آگ کو
تیری کومل آنکھیں دیکھ نہیں سکتی ہیں
کیسے رشتے کیسے ناطے
پیارے یہ سب وہ سکے ہیں جن کی قیمت
دنیا کے بازار میں آج بہت ہی کم ہے
سارے شہر ہوس کی دھند میں لپٹے ہیں
سچے جذبوں کے جگنو آنکھوں میں لے کر گھومنے والے
دُکھ سُکھ بانٹنے والے لوگوں کے قصے تو
صرف کتابوں میں ملتے ہیں
نفرت اور محبت کے اِن چڑھتے اور اترتے طوفانوں
میں پیارے
جس کو دیکھو اپنے اپنے کندھوں پر
اپنی خوشیوں اور غموں کا بوجھ اٹھائے چلتا ہے
پیارے کون کسی کی آگ میں جلتا ہے

اختر کاظمی

یہ کیسا موسم ہے

یہ کیسا موسم ہے
روتے ہیں تو آنسو نہیں نکلتے
ہنستے ہیں تو آنکھیں ساتھ نہیں دے سکتیں
جانے کیسا خوف لہو میں
آہستہ آہستہ گھلتا جاتا ہے
یہ کیسا موسم ہے
جاگتے ہیں تو خواہشوں کے اَن دیکھے اور
اَن چھکے ذائقے
دُور دُور سے ہاتھ ہلاتے رہتے ہیں
سونا چاہتے ہیں تو عجب عجب سے خواب
ہمیں دہشت کے گیت سناتے رہتے ہیں
یہ کیسا موسم ہے
جینے مرنے
ہنس لینے یا رونے میں کچھ فرق نہیں ہے
سونے جاگنے
ہونے اور ناں ہونے میں کچھ فرق نہیں ہے
یہ کیسا موسم ہے

Scanned with CamScanner

تنویر قاضی

رنگِ یار

نہیں جن سے ملے
اس زیست میں
شکل آشنا تک بھی نہیں
لیکن نجانے کیوں
پھر اُن کی یاد
پلتی ہے
شجر جیسے، لہکتے جسم کے
سرسبز گھاؤ میں
دھکتے دل کے
نارنجی الاؤ میں
کبھی مِل جائیں، وہ
شاید
کسی اگلے پڑاو میں
سنو
مانجھی
سمے کی برف پگھلے تو
یگوں کے بھید کی جب کھوج میں نکلو
جگہ رکھنا
سفر کرتی
ملن کی سمت
ناؤ میں

تنویر قاضی

گھڑیالی دیو نکال

جال میں اندھی مچھلیوں کے
ڈھیر پہ بیوپاری کی رال ٹپکتی ہے
مونا لیزا کا وہ
زیرِ لب مُسکانا شائد
آج سمجھ میں آئے
خوفِ جدائی کی آتش میں دہکتا
لونگ کا لشکارا دیتا ہے دعوت
لیکن کتنی چمک دمک تقسیم کرے گا
گلی گلی تاریک پڑی ہے
ٹخنہ ٹلتے
چھن چھن چھن چھن
اشرفیوں کا تھال گرا ہے
لُوٹنے آگے کون بڑھے
گہرے گدلے پانیوں میں سے
سِکہ ڈھونڈنے والے بالک
سہمے سہمے
روکے سانس کھڑے ہیں
ہاتھی کے پاؤں میں موچ آنے تک
آہستہ آہستہ
ایک دھمال نڈھال ہوئی ہے
پانی بھرے مٹکوں کو گراتی
زیست بساط اُلٹاتی۔۔پاگل کور ہوا
دھارا اپنی چال چلے
تھامے وقت نہیں تھمتا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

Scanned with CamScanner

ندیم عزیز

حیاتِ نو

دیا بجھا دو
کہ نیلگوں آسماں کے نیچے
زمیں کا خیمہ جلا ہوا ہے
ضمیر کی موت ہو چکی ہے
وفا کے معنی بدل گئے ہیں
ریگزاروں میں، کوہساروں میں، وادیوں میں
پیامِ صبح کا استعارہ
وہ رات کا آخری ستارہ
بجھا ہوا ہے

دیا بجھا دو
دیا یہ خیرات کا دیا ہے
یہ روشنی کا ذرا سا قطرہ
فصیلِ شب پر مہیب سائے
بنا رہا ہے
ظلمتوں کے وہ سارے منظر دکھا کے جیسے
ڈرا رہا ہے
سحر کی امید قتل کر دی
سچ کو سولی چڑھا دیا ہے
مگر..... لہو کے اڑتے ہوئے شرر سے
کوئی صبح تو ہو گی!
دیا بجھا دو
کہ روشنی کی چراغِ جاں سے نمود ہو گی
انہی اندھیروں کے درمیاں سے نمود ہو گی

ندیم عزیز

شامی بچے کی موت پر

مجھے مت بتاؤ کہ کیا ہوا، مجھے چین سے یونہی رہنے دو
مرے سامنے گلِ تر رکھو، کوئی اشک بہتا ہے بہنے دو
مجھے قہقہوں سے ہے اک غرض، مرا جام عیش بھرا رہے
سرِ بزم دورِ جنوں رہے، جسے گرنا ہے اسے گرنے دو
میں تو جی رہا ہوں خوشی خوشی، کبھی نوچ کر، کبھی چھین کر
یہ جو پاؤں میں ہے پڑا ہوا، اسے مرنا ہے اسے مرنے دو
لبِ یار کی رہے گفتگو، نگہ ناز کی رہے جستجو
رہے روشنی مرے چار سو، بھلے خون جلتا ہے جلنے دو
کوئی شام شہرِ خیال کی، کرو بات حسن و جمال کی
مرے ہم وطن مرے ساتھ چل، یہی چلنا ہے یہی چلنے دو
نہ دھیان چیخ و پکار پر، نہ گمان قتلِ بہار پر
مجھے بے حسی کا خمار ہے، مجھے بے حسی میں گذرنے دو
کوئی خواب نہ کوئی آرزو، فقط ایک پھول ہے ریت پر
مجھے کیا غرض کہ اٹھاؤں میں، جو بکھرنا ہے وہ بکھرنے دو

Scanned with CamScanner

روہنگیا

نسل در نسل

صدہا قرنوں سے

نوکِ سناں پہ سر ٹکائے

تپتی زمیں پہ ایڑیاں اٹھائے

بچھو، بچھونوں سے لپٹے

وہ اب بھی زندہ ہیں!

جانے کب سے زندہ ہیں؟

بدھا کے ماننے والوں کے بیچ

مکتی نجات کے دلدادوں کے بیچ

سرخ گندم کی طرح پسنے کو

وہ تیار رہے ہیں

اور چھن چھن لہو کی بوندیں

راستہ بناتی

سندر بن تک چلی آتی ہیں

بوندھوں کو چاٹتے، سر منڈھائے کچھ لوگ

ان گھپاؤں کے باہر کھڑے ہیں

شیر سہمے لرز رہے ہیں

خطوط

مرے ہوؤں کے خطوط دفن کر دینے چاہیں

یا پھر انھیں زندہ جلا دینا چاہیے

یہ رات کے آخری پہر میں

سرگوشیاں کرتے ہیں

ان کی دبی دبی آوازوں سے

جسم کارواں رواں لرز اٹھتا ہے

میں انھیں خاموش ہونے کا کہتا ہوں

مگر وقفے وقفے سے

ان کی سرگوشی جاری رہتی ہے

میں ایک شٹ اپ کال دیتا ہوں

وہ سہم جاتے ہیں

کچھ دیر خاموش رہتے ہیں

خود کو مرا ہوا ظاہر کرتے ہیں

لیکن ان کی سرگوشی

پھر سے شروع ہوتی ہے

میں مزید کچھ کہہ نہیں پاتا

خاموش رہتا ہوں

دھیرے دھیرے ان کی سرگوشیوں میں

شامل ہوتا ہوں

رات ہمارے درمیاں

بہکنے لگتی ہے

اور بسر جاتی ہے۔

Scanned with CamScanner

حریم حیدر

قطعات

ایک تقریب میں وہ پیلا لباس
بھولی صورت پہ دھوپ کا چشمہ
یوں لگا جس طرح اُبلتا ہو
اُس کے پیکر سے روپ کا چشمہ

○

رنگ اُڑنے لگے تصویروں کے
حرف دھندلا گئے تحریروں کے
دل کے لٹنے کا سبب یاد آیا
فیصلے تھے یہی تقدیروں کے

حریم حیدر

زندگی

کوئی پوچھے
کسی سے ہاتھ آدھا کیوں ملاتی ہے
کسی سے گرم جوشی سے مصافحہ
اور کسی سے اس طرح ملتی ہے جیسے
دو محبت کرنے والے ایک جائیں
ہمیشہ ساتھ رہنے کی قسم کھائیں
مگر سب
زندگی کی اپنی مرضی ہے
یہ جو چاہے رویّہ
جس سے چاہے
جس طرح چاہے روا رکھے
مگر پھر بھی
نہ جانے کیوں
میں اپنی عمر کی اس آخری منزل پہ بھی
امید کے دامن سے لپٹا ہوں
کہ شاید زندگی
اک بار
اپنے دلنشیں چہرے کا رخ میری طرف کر لے
مجھے بس موت سے پہلے
ذرا سا مسکرا کر
اتنا کہہ دے
ہاں تجھے میں جانتی ہوں!

Scanned with CamScanner

ڈاکٹر منیر رئیسانی

جڑی بوٹیاں بیچنے والوں کا براہوءزبان میں آوازہ

عہد سے کٹ کر جینے والے فاقہ رنگ یہ جسم
فراٹے بھرتی دنیا میں رہ گ ؟ لنگ یہ جسم
وقت کی ضربوں نے کر ڈالا ان کو نیلوں نیل
آج کے دن ھے آنکھ رہی ان کے غم کی زنبیل

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر منیر رئیسانی

پیمان
(اپنی براہوءنظم کا ترجمہ)

چراغوں کا سفر
ہر صبح ہوتا ھے مکمل
مگر
ہر شام
چل پڑتے ہیں پھر سے!

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر منیر رئیسانی

آمدِ بہار

جب بادام پہ پھول آئیں گے
دور دیس کو جانے والے
سارے چہرے لوٹ آئیں گے

☆☆☆☆☆

احمد طلال آصف

عشق

عشق افلاک کے زینون میں گزر رکھتا ہے
عشق سدرہ سے بھی آگے کی خبر رکھتا ہے
اس ستارے کی چمک آئینہ خانوں تک ہے
اس کی پرواز زمانوں سے زمانوں تک ہے
عشق ہی صبحِ ازل کن کی اذاں تھا اور ہے
عشق ہی رازِ حقیقت تھا نہیں تھا اور ہے
عشق آفاق ہے ادراک ہے بینائی ہے
عشق میں رازِ انا الحق سے شناسائی ہے
عشق یعقوب کا گریہ ہے زلیخا کا یقیں
عشق بھڑکے ہوئے شعلوں کو کرے پھول کہیں
عشق نغمہ ہے فسوں ریز کسی عالم کا
وقت کی رو سے کہیں تیز کسی عالم کا

Scanned with CamScanner

قائم نقوی

محبت یاد رہتی ہے

کہانی کی کہانی میں
کہانی کی روانی میں
کہانی یاد ہو تو پھر
مسافر اپنا رستہ بھول جاتے ہیں
کئی اک یاد میں رہ کر
نئی دنیا بساتے ہیں
جو دھڑکن اور سانسوں کے
سبھی سُر تال سے مل کر
سُنے اور اَن سُنے صحراؤں میں
گیتوں کی صورت لہلہاتے ہیں
محبت کھو بھی جائے تو
محبت یاد رہتی ہے

قائم نقوی

بے ترتیب کہانی

قصے کئی زمانوں کے
سانسوں کی ڈوری میں اٹکے
سپنے گئے زمانوں کے
دل دھڑکن میں گونج رہے ہیں
لمحہ لمحہ بہتے جائیں
دل دریا میں آن سمائیں
یادوں کی مٹی اور پانی
اپنی اپنی چھب دکھلائیں
دھڑکن دھڑکن آس دلائیں
آنکھیں جلتی بجھتی جائیں
تاریکی میں دیکھتی جائیں
چہرے گڈمڈ ہوتے جائیں
ہر اک گام پہ دھوکا کھائیں
ہونٹوں پہ خاموش صدائیں
سناٹوں کی سائیں سائیں
ہر اک سانس میں زخمی آہیں
اندر آئیں باہر جائیں
پیار محبت حسن جوانی
خواب کئی سہانے سے
قصے کئی زمانے سے
دل دریا میں بہتے جائیں
یادوں کی مٹی اور پانی
ملتے اور بچھڑتے جائیں
چہرے گڈمد ہوتے جائیں

Scanned with CamScanner

بزمِ نمود

رفعت زہرا زیدی، ہری پور

جناب نقوی صاحب!

السلام علیکم! ''نمود'' اکتوبر تا دسمبر..... کی برف آلود صبح میں کانپتا سا، ٹھٹھرتا ہوا آن وارد ہوا..... اللہ اللہ کر کے یہ سال تمام ہوا لیکن اپنے ساتھ بہت کچھ لے گیا۔ اللہ کرے سال نو ملک وملت کے لئے باعث امن وسکون اور کامیابیوں اور کامرانیوں کا گہوارہ ثابت ہو.....

لیجئے! ہم نے دراوراق وا کیا تو ہماری نظر الفاظ کے سیاہ نگینوں پر رکتی اور پھر آگے بڑھتی چلی گئی۔ اور علم وآگہی کے کئی سندر موتی ذہن کی ناپختہ دیواروں پر چسپاں ہوتے چلے گئے۔ بہت شکریہ!

اس شمارے میں بھی حمد، نعت، سلام، نقبت، یادِ حسین اور نوحہ حسین کے اشعار اللہ پاک، نبی کریمؐ اور اہل بیت اطہار کی محبت سے مزین اشعار بہت پسند آئے۔ اس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہوگی۔

حمد:

شمر سجاتا ہے ڈالی ڈالی، اناج دیتا ہے بالی بالی

ندیم عزیز:

ہیں تیرے در کے سبھی سوالی، کرم ہے پروردگار تیرا

شجر کو زیبا ہے ایک قامت، حجر میں موجود استقامت

ہر ایک شے باکمال تیری، ہر اک ادا میں وقار تیرا

نعت رسول مقبولؐ:

کچھ خوف ہے دوزخ کا نہ خلد کی خواہش

محمد ظفر الحق چشتی:

میرے تو رگ وپے میں سمایا ہے مدینہ

اجمیر ہو، شہر نجف ہو کہ حرم ہو

ہر شہر میں ہے مجھ کو نظر آیا مدینہ

یادِ حسینؑ:

یادِ حسین میں ہے رسولِ خدا کی یاد

ایزد عزیز:

مشکل کشائی کی یاد ہے خیر النساء کی یاد

Scanned with CamScanner

نیزے کے ساتھ چھین گئی، اس ردا کی یاد
زنداں میں جس کی قبر ہے اس بے خطا کی یاد

ساجد گل عمر

سلام: زینب کی گفتگو سے لرزنے لگا یزید
جیسے تھا اس کے سامنے پیکر حسین کا
ذکر حسین ختم نہیں کر سکا یزید
جاری ہے ذکر روح کے اندر حسین کا

مرتضیٰ ساجد

بزم نمود میں غزلیات کا دامن بھی شاعری کے غنچہ ہائے رنگا رنگ سے سجا خوب بہار دے رہا ہے۔ اختر کاظمی کی غزلیات پسند آئیں۔

ہم ازل سے اَن چاہے ضابطوں میں رہتے ہیں
زندگی کا لالچ ہے قاتلوں میں رہتے ہیں

غزلیات کا دامن بھی زمانہ موجود کے بخشے کڑوے کسیلے جزبات اور کہیں کہیں دل کے خوبصورت اور نازک احساسات سے رچا بسا نظر آیا۔

اختر کاظمی صاحب کی غزلیات پسند آئیں۔

ہماری زندگیاں ہیں جہاز ٹوٹنے تک
ہم ازل سے اَن چاہے ضابطوں میں رہتے ہیں
ہمیں ملی نہیں کوئی حفاظتی کشتی
زندگی کی لالچ ہے قافلوں میں رہتے ہیں

اور کرامت گردیزی کی غزلیات اوسط درجے پر مبنی معاشرے کے باسیوں کی دلی پکار کی عکاسی کر رہی ہیں۔

دشتِ جنوں میں نقشِ تمنا بنا ہوا
ایک آئینہ ہوں گرد میں اپنا اٹا ہوا
منظر نہیں ہوں میں پس منظر ہوں دوستو
کہرے کے اس طرف ہوں وفا بیچتا ہوا

ڈاکٹر نبیل احمد صاحب کی دونوں غزلیات خوب ہیں..... ماشاءاللہ

Scanned with CamScanner

افضال بیلا جناب کیا بات ہے آپ کے کلام کی؟؟

میرے وجود نے محبوس کر دیا ہے مجھے
فرار ہونے کو اب در تلاش کرتا ہوں
میں چاہتا ہوں مجھے بھی تو گنگنائے کوئی
غزل ہو خود بھی وہ دلبر تلاش کرتا ہوں
اے چارہ گرو میری یہ آنکھیں ہی بدل دو
جو نقش ہوئے ان میں نظارے نہیں جاتے

اور حصہ مضامین میں 'امجد اسلام امجد'' تصنیف محمد حنیف صاحب اور عابد حسین منٹو کا تحریر کردہ مضمون ''یوسف حسین'' دونوں پسند آئے۔

امجد اسلام امجد کے مضمون میں امجد اسلام امجد کے اشعار اور ان کے محاسن سیرت نے مضمون کو پُرکشش بنا دیا ہے۔

جناب شہریار خان صاحب کا تحریر کردہ افسانہ ایک اچھی کاوش ہے لیکن افسانہ میں سوتیلی ماں کا وہی روایتی کردار ہے جو ملعون گردانا جاتا ہے۔ اس افسانہ میں یہ کردار باپ کے لئے بدگمانی اور باعث ذلت اور بیٹی کے لئے موت کا پروانہ بنا۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ''سوتیلی ماں'' میں اپنی سگی ماں جیسی خوبیاں کسی نہ کسی اچھے سانچے میں ڈھال کر پیش کی جائیں۔ ڈرامے، افسانے اور فلمیں اس کے مؤثر ذرائع ہوں گے۔ اور قوم کی مائیں اس آئینے میں فٹ ہونے کی کوشش کریں گی۔

استدعا ہے کہ پروف ریڈنگ پر توجہ دی جائے بعض جگہوں پر اس کی بدنظمی ''الفاظ'' کا بھرتہ بنا دیتی ہے۔ جو نہ پڑھا جائے صحیح اور نہ سمجھا جائے.....کیا خیال ہے؟؟

.....

جناب نقوی صاحب!

السلام علیکم! ماہنامہ ''نمود'' جنوری تا مارچ موصول ہوا۔ اوّل و اعلیٰ گلہائے عقیدت نے دل و نظر کو دلی طمانیت اور انبساط سے مالا مال کیا۔ خصوصاً پروفیسر ناصر صاحب کے تحریر کردہ سلام کی جدت پسند آئی۔

Scanned with CamScanner

چاہیں کہ ہو سفارشی نانا حسین کا
دل میں مگر ہے آج بھی چاہت یزید کی

طاہر مجید کی شاعری کے موضوع پر مضمون خوشبو کا سفر پسند آیا۔

میں جو کہنے لگوں لوگو، مجھے کہنے دینا
لفظ ہونٹوں پر رکے گا تو دہائی دے گا

اب خواب ہو گئی ہیں غمی کی نشانیاں
اب تو ہمارے غم میں بھی کوئی غمی نہیں

درست فرمایا..... یہ جانکاہ الفاظ غم کے سفینے میں ڈوبے لوگوں کے دلوں میں زہر میں بجھے ہوئے تیر کی طرح پیوست ہو جاتے ہیں۔ اب درد و غم انسان کا اوڑھنا بچھونا بن جائے تو پھر انسان خوگر رنج ہو جاتا ہے۔

پروفیسر سلیم الرحمٰن کا تحریر کردہ مضمون ''منیر نیازی ایک بلند پایہ شاعر بھی پسند آیا۔ اردو میں کہیں کہیں پنجابی زبان کی سنگت نے مضمون کو نیچرل انداز میں ڈھال دیا ہے۔ اپنی مادری زبان کے رسیا لوگ غیر زبان میں بھی اپنی زبان کا رس گھول کر اسے دو آتشہ بنا دیتے ہیں۔ آج کل مزاح نگار اردو میں پنجابی زبان کا دیسی گھی کا بھگار دے کر خوب فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ان کی غزل کا حقیقت سے بھرپور اور درد سے لبریز شعر:

کچھ وقت چاہتے تھے کہ سوچیں تیرے لئے
تو نے وہ وقت ہم کو زمانے نہیں دیا

محرومی نے گھیر رکھی ہیں خوشیوں کی باراتیں
خوف کی دھوپ میں جلتے دن دکھ سے یخ بستہ راتیں

اب اغراض سے وابستہ ہیں سب رشتے سب جذبے
خوابوں اور کتابوں میں ہیں مہر و خلوص کی باتیں

درد و غم کی سیاہی میں ڈوبے الفاظ کی دنیا کو اداس اداس کر جاتے ہیں۔ اختر کاظمی کی دونوں غزلیات درون غم کی خوب عکاسی کر

Scanned with CamScanner

اردو کی سب سے جدید لغت جس کے بغیر آپ کی لائبریری نامکمل

علمی اُردو لغت

جس میں ڈیڑھ لاکھ الفاظ کے معانی و مطالب، اصطلاحات
محاورات کے صحیح تلفظ بذریعہ اعراف، علمی و تحقیقی ماہرین
عام قارئین اور طلباء کیلئے نہایت مفید

(جامع) علمی اردو لغت قیمت -/1000 روپے

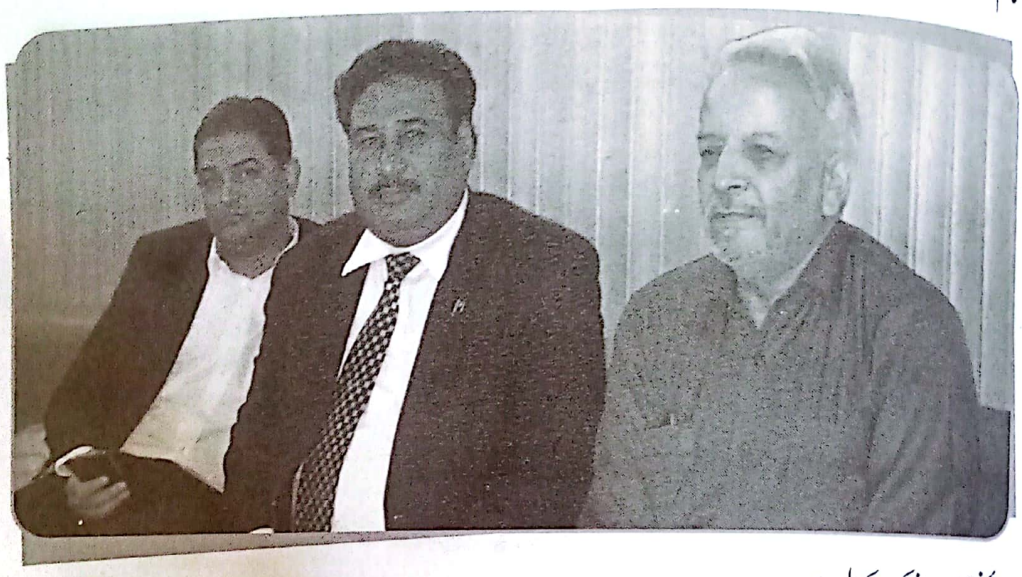
(متوسط) علمی اردو لغت قیمت -/400 روپے

ملنے کا پتہ
علمی کتاب خانہ
کبیر سٹریٹ اُردو بازار، لاہور
042-37353510

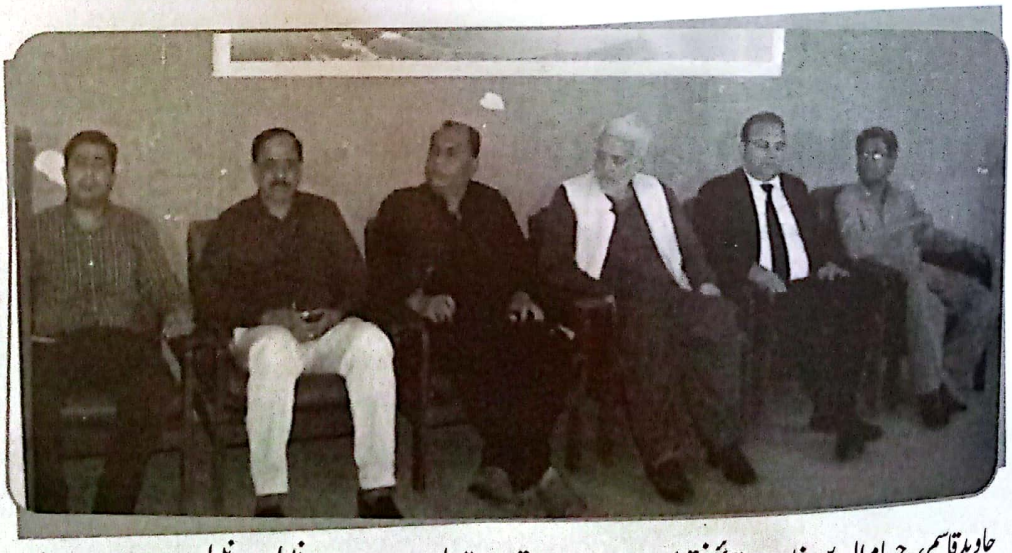
Scanned with CamScanner



قائم نقوی، ڈاکٹر افضال حسین



قائم نقوی، شوکت کمال چیمہ



جاوید قاسم، حسام الدین خان، قائم نقوی، عرفان صادق، مقبول احمد چوہان، نبیل احمد نبیل

Scanned with CamScanner

MONTHLY
NAMOOD LAHORE
APRIL, MAY, JUNE 2019



یونس علی دلشاد، قتیل شفائی، قائم نقوی



ڈاکٹر ناہید شاہد، آصف جاہ، قائم نقوی، شعیب بن عزیز، افتخار قیصر، تنویر ظہور، نعیم شیخ



نجیب احمد، اجمل نیازی، گلزار وفا چوہدری، قائم نقوی

Scanned with CamScanner